Undergraduate Program
Ability Enhancement Courses (AEC) (MIL)
اردو نثر: زبان اور قواعد کا مطالعہ
Urdu Nasr: Zaban aur Qawaed ka Mutala (2CP)
Course Code: AECL206
Book Code: AECL2061

यशवंतराव चव्हाण महाराष्ट्र ओपन युनिवर्सिटी ज्ञानगंगा घरोघरी

Semester-IV

کتاب : اول

Book: 01

افسانوی نثر کا مطالعہ

Afsanvi Nasr ka Mutala

مصنف : ڈاکٹر حمیرا عالیہ

اکائی 1: سیر پہلے درویش کی: میر امن دہلوی
اکائی 2: عیدگاہ: پریم چند
اکائی 3: جامن کا پیڑ: کرشن چندر
اکائی 4: ٹوبہ ٹیک سنگھ: سعادت حسن منٹو

Yashwantrao Chavan Maharashtra Open University, Nashik

Vice-Chancellor: Prof. Sanjeev Sonawane

Director : Prof. Nagarjun Wadekar, School of Humanities and Social Sciences

School Council, School of Humanities and Social Sciences

Prof. Nagarjun Wadekar (Chairman)
Director, School of Humanities
and Social Sciences,
Y.C.M. Open University,
Nashik (MS)

Prof. Jaideep Nikam
Director and Senior Professor, School
of Continuing Education,
Y.C.M. Open University,
Nashik (MS)

Prof. Shivaji Sargar
Director, Distance and Online
Education Centre, University of
Mumbai, Vidyanagari,
Kalina, Mumbai (MS)

Prof. Prakash Pawar
Head, Department of Political Science,
Shivaji University, Vidyanagar,
Kolhapur (MS)

Prof. Rajendra Kumbhar
(Retired) Head, Department of
Library and Informatics, Savitribai
Phule Pune University,
Ganeshkhind Road, Pune (MS)

Prof. Sanjay Tambat
Head, Department of
Communication and Journalism,
Savitribai Phule Pune
University,
Ganeshkhind Road, Pune (MS)

Prof. Chetana Kamalaskar
Director, School of Science,
Y.C.M. Open University,
Nashik (MS)

Prof. Sandeep Chaudhary
Head, Department of Sociology,
Saraswati Bhuvan College, Saraswati
Colony, Aurangpura, Chhatrapati
Sambhajinagar (MS)

Prof. Devendra Ingale
Head, Department of History,
Moolji Jaitha College
(Autonomous), Jalgaon (MS)

Dr. Latika Gaikwad
Associate Professor,
School of Commerce and Management,
Y.C.M. Open University,
Nashik (MS)

Dr. Subhash Sonune
Assistant Professor,
School of Education,
Y.C.M. Open University,
Nashik (MS)

Programme Advisory Committee (PAC)

Prof. Nagarjun Wadekar (Chairman)
Director, School of Humanities and
Social Sciences,
Y.C.M. Open University,
Nashik (M.S.)

Prof. Mohammad Shahid Husain
Former Chairman,
Centre of Indian Languages,
School of Language, Literature and
Culture Studies, JNU, New Delhi

Prof. Mohd. Moazzamuddin
Department of Education in
Languages, NCERT,
Sri Aurobindo Marg,
New Delhi

Prof. Mohd. Mahfooz Khan
(Ahmad Mahfooz)
Head, Department of Urdu,
Jamia Millia Islamia,
New Delhi

Prof. Abu Shaheem Khan
Department of Urdu,
Maulana Azad National Urdu
University, Hyderabad, (T.S.)

Prof. Shah Alam
Department of Urdu,
Jamia Millia Islamia,
New Delhi

Prof. Sardar Pasha
Head, Department of Urdu,
Azad Mahavidyalaya,
Ausa Latur (M.S.)

Prof. Quazi Naweed A. Siddiqui
Head, Department of Urdu,
Maulana Azad College,
Sambhajinagar (M.S.)

Dr. Pervez Ahmed
Associate Professor,
Centre of Indian Languages,
JNU, New Delhi

Dr. Abu Omair (Omair Manzar)
Associate Professor,
Department of Urdu,
Maulana Azad National Urdu University,
Lucknow Campus, Lucknow

Dr. Abdullah Imteyaz Ahmad
Associate Professor and Head,
Department of Urdu,
University of Mumbai, Mumbai

Dr. Wazhul Qamar Siddiqui
Assistant Professor,
Department of Urdu,
University of Mumbai, Mumbai

Course Code : AECL206, Book Code: AECL2061, Book Title: Afsanvi Nasr ka Mutala

Yashwantrao Chavan Maharashtra Open University

Vice Chancellor : Prof. Sanjeev Sonawane

Director: Prof. Nagarjun Wadekar, School of Humanities and Social Sciences

Writer

Dr. Humaira Alia
Department of Urdu
University of Lucknow
Uttar Pradesh- 226007

Editor

Dr. Abu Omair (Omair Manzar)
Associate Professor, Department of Urdu,
Maulana Azad National Urdu University,
Lucknow Campus, Daliganj, Lucknow-206020

Review Committee

Prof. Ahmad Khan
Centre for Urdu Culture Studies,
Maulana Azad National Urdu University,
Gachibowli Hyderabad-500032

Prof. Sayyed Zakir Ali
Ex. Principal Kohinoor College Khudabad
Plot No. 04, Near Madarsa Anwar ul uloom
Almas colony, Mehrun, Jalgaon -425003 (M.S)

Dr. Sanjay Kumar
Associate Professor and Head
Department of Urdu, University of Allahabad
Prayagraj, Uttar Pradesh-211002

Dr. Ansari Masood Akhtar
Associate Professor and Head
Department of Urdu,
MSS's Ankushrao Tope College, Jalna (M.S.)

Dr. Anwaruddin
Associate Professor , Department of Urdu
Govt. Degree College for Women
Husaini Alam, Hyderabad-500046

Dr. Abdurrab
Associate Professor,
Department of Urdu, Maulana Azad College
Chhatrapati Sambhajinagar, Maharashtra-431001

Programme Coordinator

Dr. Rasheed Ashraf Khan
Academic Coordinator (Assistant Professor)
School of Language, Literature and Culture Studies
YCMOU, Nashik

IT & Language Editor

Dr. Rasheed Ashraf Khan
Academic Coordinator (Assistant Professor)
School of Language, Literature and Culture Studies
YCMOU, Nashik

Production

Mr. Vilas Badhan
Head, (Act.) Print Production Centre, YCMOU, Nashik

© 2026 Yashwantrao Chavan Maharashtra Open University, Nashik

☆ **First Edition:** December, 2026 **Publication No.:**
☆ **Proof Reader:** Mr. Azmatullah Siddiqui
☆ **Printed by:**
☆ **Published by :** Registrar, Yashwantrao Chavan Maharashtra Open University, Nashik
ISBN:

اردو نثر: زبان اور قواعد کا مطالعہ (AECL206)

کورس کی ساخت

کتاب اول: افسانوی نثر کا مطالعہ

اکائی 1 : سیر پہلے درویش کی: باغ و بہار، میر امن دہلوی

اکائی 2 : عیدگاہ؛ پریم چند

اکائی 3 : جامن کا پیڑ؛ کرشن چندر

اکائی 4 : ٹوبہ ٹیک سنگھ؛ سعادت حسن منٹو

کتاب دوم: غیر افسانوی نثر کا مطالعہ

اکائی 1 : زبان گویا، الطاف حسین حالی

اکائی 2 : سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ، محمد حسین آزاد

اکائی 3 : جھینگر کا جنازہ، خواجہ حسن نظامی

اکائی 4 : میر ناصر علی، شاہد احمد دہلوی

اردو نثر: زبان اور قواعد کا مطالعہ (AECL206)

کورس کا تعارف

زیرِ نظر کورس (AECL206) ''اردو نثر: زبان اور قواعد کا مطالعہ'' اردو نثر کی مختلف صورتوں، اسالیب اور فنی خصوصیات سے طلبہ کو روشناس کرانے والا اہم کورس ہے۔ اس کورس میں اردو کی افسانوی اور غیر افسانوی نثر کے منتخب نمونوں کا مطالعہ شامل ہے۔ اس کے ذریعے طلبہ اردو نثر کے ارتقائی سفر، فنی تنوع اور موضوعاتی وسعت کو سمجھنے کے قابل ہوتے ہیں۔

کورس کی پہلی کتاب ''افسانوی نثر کا مطالعہ'' میں اردو کے اہم افسانوی اور قصہ نما نثری نمونوں کو شامل کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے طلبہ کو قصہ پن، پلاٹ، کردار نگاری، مکالمہ، منظر نگاری اور اسلوبِ بیان جیسی افسانوی خصوصیات سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ منتخب متون میں مختلف سماجی، تہذیبی اور انسانی مسائل کی عکاسی ملتی ہے، جس سے اردو افسانوی نثر کے موضوعاتی تنوع کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب کے ذریعے طلبہ کلاسیکی قصہ نگاری سے جدید افسانے تک نثری اظہار کی مختلف صورتوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس میں انسانی جذبات، معاشرتی ناہمواریوں، تہذیبی اقدار، سیاسی حالات اور زندگی کے مختلف تجربات کو فنی انداز میں پیش کرنے کی مثالیں ملتی ہیں۔

کورس کی دوسری کتاب ''غیر افسانوی نثر کا مطالعہ'' میں اردو کی غیر افسانوی نثر کی ان تحریروں کو شامل کیا گیا ہے جو افسانوی قصہ سازی کے بجائے فکری، اصلاحی، طنزیہ، سوانحی اور مشاہداتی اظہار کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اس کتاب کے ذریعے طلبہ مضمون نگاری، طنز و مزاح، سوانحی تحریر اور شخصی خاکے کی مختلف خصوصیات سے واقف ہوتے ہیں۔ غیر افسانوی نثر کے منتخب نمونوں میں زبان و بیان کی دل کشی، فکری گہرائی، سماجی شعور اور مشاہدے کی قوت نمایاں ہے۔ ان تحریروں کے مطالعے سے طلبہ کو اردو نثر کے مختلف اسالیب اور اظہار کے طریقوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

یہ کورس طلبہ میں متن فہمی، تنقیدی مطالعے اور ادبی تجزیے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ اس کے ذریعے ''افسانوی اور غیر افسانوی نثر کا مطالعہ'' اردو نثر کے فنی، فکری اور موضوعاتی تنوع کو سمجھنے اور منتخب ادبی متون کے ذریعے نثر کے مطالعے کی بنیادی صلاحیتیں پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

اردو نثر: زبان اور قواعد کا مطالعہ (AECL206)

کورس کے مقاصد اور نتائج

کورس کے مقاصد Objectives

1. طلبہ کو افسانوی اور غیر افسانوی نثر کے مفہوم، خصوصیات اور اہمیت سے واقف کرانا۔
2. طلبہ کو منتخب افسانوی نثری متون کے موضوعات، فنی عناصر اور اسلوبِ بیان سے واقف کرانا۔
3. طلبہ کو منتخب غیر افسانوی نثری متون کے فکری، اصلاحی، طنزیہ اور اسلوبی پہلوؤں سے واقف کرانا۔
4. طلبہ میں نثری متون کے فہم، تجزیے اور تنقیدی مطالعے کی صلاحیت پیدا کرنا۔

کورس کے نتائج Outcomes

1. طلبہ افسانوی اور غیر افسانوی نثر کے مفہوم، خصوصیات اور اہمیت سے واقف ہوں گے۔
2. طلبہ منتخب افسانوی نثری متون کے موضوعات، فنی عناصر اور اسلوبِ بیان کو سمجھنے کے قابل ہوں گے۔
3. طلبہ منتخب غیر افسانوی نثری متون کے فکری، اصلاحی، طنزیہ اور اسلوبی پہلوؤں کو سمجھنے کے قابل ہوں گے۔
4. طلبہ نثری متون کے فہم، تجزیے اور تنقیدی مطالعے کی صلاحیت حاصل کرنے کے قابل ہوں گے۔

کتاب1: افسانوی نثر کا مطالعہ (AECL2061)

کتاب کا تعارف

زیرِ نظر کتاب ''فسانوی نثر کا مطالعہ'' چار اکائیوں پر مشتمل ہے۔ کتاب کی پہلی اکائی ''سیر پہلے درویش کی: میر امن دہلوی'' ہے۔ اس اکائی میں میر امن دہلوی کی معروف داستانی تصنیف ''باغ و بہار'' کے منتخب حصے ''سیر پہلے درویش کی'' کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے ذریعے اردو کی داستانی روایت، قصہ گوئی اور اسلوبِ بیان کی اہم خصوصیات کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ متن میں واقعاتی تسلسل، کردار نگاری، منظر کشی اور زبان کی سادگی و روانی نمایاں ہے۔ اس مطالعے سے طلبہ کو کلاسیکی اردو نثر کی ساخت اور فنی خصوصیات سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ میر امن کے طرزِ بیان، محاوراتی زبان اور قصہ گوئی کے انداز کو بھی اس اکائی میں خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔ کتاب کی دوسری اکائی ''عیدگاہ: پریم چند'' کو شامل کیا گیا ہے۔ اس اکائی میں پریم چند کے معروف افسانہ ''عیدگاہ'' کا مطالعہ شامل ہے۔ افسانے میں انسانی جذبات، غربت، محبت، قربانی اور خاندانی رشتوں کو مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ حمید کا کردار معصومیت، احساسِ ذمہ داری اور قربانی کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ افسانے کی سادہ اور مؤثر زبان قاری کے جذبات کو متاثر کرتی ہے۔ اس اکائی کے ذریعے طلبہ افسانے کی فنی ساخت، کردار نگاری، واقعاتی ترتیب اور سماجی معنویت کو سمجھنے کے قابل ہوتے ہیں۔

تیسری اکائی ''جامن کا پیڑ: کرشن چندر'' کے عنوان سے ہے۔ اس اکائی میں کرشن چندر کا معروف طنزیہ افسانہ ''جامن کا پیڑ'' کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ افسانے میں سرکاری نظام، دفتری پیچیدگی، بے حسی اور فیصلہ کرنے میں تاخیر کو طنزیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جامن کے پیڑ کے نیچے دبے ہوئے شخص کا واقعہ پورے نظام کی غیر فعالیت اور انسانی مسائل سے بے اعتنائی کی علامت بن جاتا ہے۔ کرشن چندر نے طنز، مزاح اور علامتی انداز کے ذریعے ایک اہم سماجی مسئلے کو اجاگر کیا ہے۔ اس اکائی میں افسانے کے طنزیہ اسلوب، کردار نگاری اور سماجی معنویت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کی چوتھی اور آخری اکائی ''ٹوبہ ٹیک سنگھ: سعادت حسن منٹو'' ہے۔ اس اکائی میں سعادت حسن منٹو کا شہرۂ آفاق افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' شامل کیا گیا ہے۔ افسانہ تقسیمِ ہند کے پس منظر میں انسانی المیے، بے وطنی، شناخت اور سیاسی فیصلوں کے انسانی اثرات کو موضوع بناتا ہے۔ بشن سنگھ کا کردار تقسیم کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ذہنی اور جذباتی کیفیت کی علامت بن کر سامنے آتا ہے۔ منٹو نے مختصر، مؤثر اور حقیقت پسندانہ اسلوب کے ذریعے تقسیم کے المیے کو پیش کیا ہے۔ اس اکائی کے ذریعے طلبہ افسانے کی علامت نگاری، کردار نگاری، حقیقت پسندی اور فنی اثر آفرینی کو سمجھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کتاب اردو افسانوی نثر کے کلاسیکی، اصلاحی، طنزیہ اور حقیقت پسندانہ رجحانات سے طلبہ کو روشناس کراتی ہے اور منتخب افسانوی متون کے ذریعے ان کے ادبی اور تنقیدی شعور کو فروغ دیتی ہے۔

طلبہ کی سہولت کے پیشِ نظر ہر اکائی کے درمیان خود اکتسابی سوالات اور اکائی کے آخر میں جوابات دیے گئے ہیں تاکہ وہ اپنی معلومات کی جانچ خود کر سکیں۔ ہر اکائی میں زبان کی مختلف مہارتوں کے ساتھ قواعد کے مختلف اجزا بھی شامل کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ مشقی سوالات بھی ہیں اور مشکل الفاظ کے معنی بھی درج کیے گئے ہیں۔ تحریری سرگرمیوں کے حوالے سے ان کے قواعد کی جانچ بھی شامل ہے۔ آخر میں مزید مطالعے کے لیے موضوع سے متعلق اہم کتابوں کے نام درج ہیں تاکہ طلبہ ان سے استفادہ کر سکیں۔

اکائی 1 : سیر پہلے درویش کی، میر امن دہلوی

ساخت

1.0 مقاصد

1.1 تمہید

1.2 موضوع کی وضاحت

1.2.1 سیر پہلے درویش کی (منتخبہ متن)

1.2.2 سیر پہلے درویش کی کا فنی تجزیہ

خودا کتسابی کے لیے سوالات I

1.2.3 زبان کی مہارتیں (پڑھنے کی مہارت)

1.2.4 قواعد

خودا کتسابی کے لیے سوالات II

1.3 الفاظ اور معنی

1.4 خودا کتسابی سوالات کے جوابات I

خودا کتسابی سوالات کے جوابات II

1.5 خلاصہ

1.6 خودا کتسابی کے لئے مشق

تحریری سرگرمیاں

کام کا تجربہ

1.7 مشقی سوالات

1.8 مزید مطالعے کے لیے کتب

1.0 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ.....

☆ کلاسیکی داستان 'باغ و بہار' کے متن اور اسلوب سے واقف ہوسکیں گے۔

☆ 'سیر پہلے درویش کی' کے قصے سے آگاہی حاصل کرسکیں گے۔

☆ پڑھنے کی مہارت کے بارے میں معلومات حاصل کرسکیں گے۔

☆ اسم اور ضمیر کی باریکیوں سے روشناس ہوسکیں گے۔

1.1 تمہید

داستان ایک طویل نثری صنف جس میں مافوق الفطرت عناصر، خیالی واقعات کا بیان، ماورائی دنیا، محبت اور مہم جوئی کے قصے اور واقعات وحادثات کا ایک طویل سلسلہ کہانی در کہانی کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ اسے ایک خیالی اور مثالی دنیا کی کہانی کہا جاتا ہے جو طلسم اور تحیر خیز واقعات سے بھرپور ہوتی ہے۔ داستانوں کا تعلق عموماً بادشاہوں، نوابوں اور رؤسا سے ہوتا ہے۔ داستان کا مرکزی کردار ایک مثالی ہیرو ہوتا ہے خوبصورت، بہادر اور نیک ہونے کے ساتھ محیر العقول کارنامے سرانجام دے سکتا ہے۔ داستانوں کا موضوع حسن و عشق، طلسم اور مہم جوئی کے واقعات پر مبنی ہوتا ہے۔ اس میں جن، بھوت، پریاں، دیو اور دیگر مافوق الفطری کردار پائے جاتے ہیں۔

باغ و بہار اردو ادب کی ایک مشہور اور کلاسیکی داستان ہے۔ یہ دراصل شمالی ہند کی پہلی نثری تصنیف 'نوطرز مرصع' سے ماخوذ ہے جسے عطا حسین تحسین نے فارسی قصہ 'چہار درویش' سے آزاد ترجمہ کیا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کے پرنسپل ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے جب ہندوستانی زبان کو سادہ اور عام فہم بنانے کا ارادہ کیا تو انہوں نے کئی قدیم داستانوں کو بھی سلیس اردو میں ترجمہ کروایا۔ اس مقصد کے تحت ۱۸۰۲ میں میر امن دہلوی نے نوطرز مرصع کو آسان اردو میں منتقل کیا جسے باغ و بہار کا نام دیا گیا۔ اس داستان میں چار درویشوں کی عبرت انگیز اور دلچسپ کہانیاں بیان کی گئی ہیں جن میں محبت، وفاداری، قربانی، اتفاق اور انسان دوستی کے مضامین نمایاں ہیں۔ بادشاہ آزاد بخت روم کی سلطنت کا تنہا وارث ہے۔ دنیا کی ہر آسائش اسے دستیاب ہے لیکن وہ اولاد کی نعمت سے محروم ہے۔ ایک دن دکھ اور غم کی کیفیت میں وہ قبرستان کی طرف جا نکلتا ہے جہاں اس کی ملاقات چار درویشوں سے ہوتی ہے جو درحقیقت مختلف ممالک کے شہزادے ہیں۔ غم کی شدت کم کرنے کے لئے یہ سب ایک دوسرے کو اپنی اپنی کہانی سناتے ہیں۔

باغ و بہار کی اصل خوبی اس کا اسلوب ہے۔ اس کی زبان نہایت سادہ، شستہ اور عوامی ہے۔ میر امن نے دہلی کی روزمرہ بول چال کو نثر میں شامل کر کے اردو نثر کو ایک نئے اسلوب سے متعارف کرایا۔ یہ داستان فصاحت، بلاغت، سلاست اور محاورہ بندی کی بہترین مثال ہے۔ اس میں شامل تمام قصوں میں دہلوی تہذیب و معاشرت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ ان خصوصیات کے باعث ہی باغ و بہار کو اردو ادب کی لازوال تصنیف کہا جاتا ہے اور میر امن کا یہ کارنامہ اردو زبان و ادب کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ زیر نظر اکائی میں ہم پہلے درویش کی سیر کا ایک حصہ پڑھیں گے۔

1.2 موضوع کی وضاحت

1.2.1 سیر پہلے درویش کی (منتخبہ متن ماخوذ از باغ و بہار؛ میر امن دلی والے)

ایک دن وہ بہن جو بجائے والدہ کے میری خاطر رکھتی تھی، کہنے لگی، اے بیرن! تو میری آنکھوں کی پُتلی اور ماں باپ کی موئی مٹی کی نشانی ہے۔ تیرے آنے سے میرا کلیجا ٹھنڈا ہوا۔ جب تجھے دیکھتی ہوں، باغ باغ ہوتی ہوں۔ تو نے مجھے نہال کیا، لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لیے بنایا ہے گھر میں بیٹھے رہنا اُن کو لازم نہیں۔ جو مرد نکھٹو ہو کر گھر سیتا ہے، اُس کو دُنیا کے لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں، خصوصاً اس شہر کے آدمی چھوٹے بڑے بے سبب تمھارے رہنے پر کہیں گے، اپنے باپ کی دولتِ دُنیا کھو کھا کر بہنوئی کے ٹکڑوں پر آ پڑا۔ یہ نہایت بے غیرتی اور میری تمہاری ہنسائی اور ماں باپ کے نام کو سبب لاج لگنے کا ہے۔ نہیں تو میں اپنے چمڑے کی جوتیاں بنا کر تجھے پہناؤں اور کلیجے میں ڈال رکھوں۔ اب یہ صلاح ہے کہ سفر کا قصد کرو۔ خدا چاہے تو دن پھریں اور اس حیرانی و مفلسی کے بدلے خاطر جمعی اور خوشی حاصل ہو۔ یہ بات سُن کر مجھے بھی غیرت آئی، اس کی نصیحت پسند کی۔ جواب دیا، اچھا اب تم ماں کی جگہ ہو، جو کہو سو کروں۔ یہ میری مرضی پا کر گھر میں جا کے پچاس توڑے اشرفی کے اصیل لونڈیوں کے ہاتھوں میں لوا کر میرے آگے لا رکھے اور بولی ایک قافلہ سوداگروں کا دمشق کو جاتا ہے، تم ان روپوں سے جنس تجارت کی خرید کرو۔ ایک تاجر ایماندار کے حوالے کر کے، دستاویز پکی لکھوا لو، اور آپ بھی قصد دمشق کا کرو۔ وہاں جب خیریت سے جا پہنچو، اپنا مال مع منافع سمجھ بوجھ لیجیو یا آپ بیچیو۔ میں وہ نقد لے کر بازار میں گیا، اسباب سوداگری

کا خرید کر ایک بڑے سوداگر کے سپرد کیا۔ نوشت وخواند سے خاطر جمع کر لی۔ وہ تاجر دریا کی راہ سے جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔ فقیر نے خشکی کی راہ چلنے کی تیاری کی۔ جب رُخصت ہونے لگا، بہن نے ایک سری پاؤ بھاری اور ایک گھوڑا اجڑاؤ ساز سے تواضع کیا، اور مٹھائی پکوان ایک خاص دان میں بھر کر ہرنے سے لٹکا دیا، اور چھاگل پانی کی شکار بند میں بندھوادی۔ امام ضامن کا روپیہ میرے بازو پر باندھا، دہی کا ٹیکا ماتھے پر لگا کر آنسو پی کر بولی، سدھارو! تمھیں خدا کو سونپا، پیٹھ دکھائے جاتے ہو، اسی طرح جلد اپنا منہ دکھائیو۔ میں نے فاتحہ خیر کی پڑھ کر کہا، تمھارا بھی اللہ حافظ ہے۔ میں نے قبول کیا۔ وہاں سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہوا، اور خدا کے توکل پر بھروسہ کر کے دو منزل کی ایک منزل کرتا ہوا دمشق کے پاس جا پہنچا۔

غرض جب شہر کے دروازے پر گیا، بہت رات جا چکی تھی۔ دربان اور نگاہ بانوں نے دروازہ بند کیا تھا۔ میں نے بہت منت کی کہ مسافر ہوں، دور سے دھاوا مارے آتا ہوں، اگر کواڑ کھول دو شہر میں جا کر دانے گھاس کا آرام پاؤں۔ اندر سے گھرک کر بولے، اس وقت دروازہ کھولنے کا حکم نہیں، کیوں اتنی رات گئے تم آئے؟ جب میں نے جواب صاف اُن سے سنا، شہر پناہ کی دیوار کے تلے گھوڑے پر سے اُتر زین پوش بچھا کر بیٹھا۔ جاگنے کی خاطر ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ جس وقت آدھی رات اِدھر اور آدھی رات اُدھر ہوئی، سنسان ہو گیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک صندوق قلعے کی دیوار پر سے نیچے چلا آتا ہے۔ یہ دیکھ کر میں اچنبھے میں ہوا کہ یہ کیا طلسم ہے؟ شاید خدا نے میری حیرانی و پریشانی پر رحم کھا کر خزانہ غیب سے عنایت کیا۔ جب وہ صندوق زمین پر ٹھہرا، ڈرتے ڈرتے میں پاس گیا، دیکھا تو کاٹھ کا صندوق ہے۔ لالچ سے اُسے کھولا۔ ایک معشوق، خوب صورت، کامنی سی عورت (جس کے دیکھنے سے ہوش جاتا رہے) گھایل، لہو میں تر بتر، آنکھیں بند کئے پڑی کُلبلاتی ہے، آہستہ آہستہ ہونٹھ ہلتے ہیں، اور یہ آواز منہ سے نکلتی ہے۔ ای کم بخت بے وفا! اے ظالمِ پُر جفا! بدلا اس بھلائی اور محبت کا یہی تھا جو تُو نے کیا؟ بھلا ایک زخم اور بھی لگا، میں نے اپنا تیرا انصاف خدا کو سونپا۔ یہ کہہ کر اُسی بے ہوشی کے عالم میں دوپٹے کا آنچل منہ پر لے لیا۔ میری طرف دھیان نہ کیا۔

فقیر اُس کو دیکھ کر اور یہ بات سُن کر سُن ہوا، جی میں آیا، کسی بے حیا ظالم نے کیوں ایسے نازنین صنم کو زخمی کیا، کیا اُس کے دل میں آیا؟ اور ہاتھ اُس پر کیوں کر چلایا؟ اُس کے دل میں تو محبت اب تلک باقی ہے جو اس جان کنی کی حالت میں اُس کو یاد کرتی ہے، میں آپ ہی آپ یہ کہہ رہا تھا، آواز اس کے کان میں گئی، ایک مرتبہ منہ سرکا کر مجھ کو دیکھا۔ جس وقت اس کی نگاہیں میری نظروں سے لڑیں، مجھے غش آنے اور جی سنسنانے لگا۔ بہ زور اپنے تئیں تھانبا۔ جرأت کر کے پُوچھا، سچ کہو تم کون ہو اور یہ کیا ماجرا ہے۔ اگر بیان کرو تو میرے دل کو تسلی ہو۔ یہ سُن کر اگرچہ طاقت بولنے کی نہ تھی آہستے سے کہا، شکر ہے۔ میری حالت زخموں کے مارے یہ کچھ ہو رہی ہے۔ کیا خاک بولوں؟ کوئی دم کی مہمان ہوں، جب میری جان نکل جاوے تو خدا کے واسطے جواں مردی کر کے مجھ بد بخت کو اسی صندوق میں کسی جگہ گاڑ دیجو۔ تو میں بھلے بُرے کی زبان سے نجات پاؤں، اور تُو داخل ثواب کے ہو۔ اتنا بول کر چُپ ہوئی۔

رات کو مجھ سے کچھ تدبیر نہ ہو سکی، وہ صندوق اپنے پاس اُٹھا لایا اور گھڑیاں گننے لگا کہ کب اتنی رات تمام ہو تو فجر کو شہر میں جا کر جو کچھ علاج اس کا ہو سکے بہ مقدور اپنی کروں۔ وہ تھوڑی سی رات ایسی پہاڑ ہو گئی کہ دل گھبرا گیا۔ بارے خُدا خُدا کر کے صبح جب نزدیک ہوئی، مُرغ بولا، آدمیوں کی آواز آنے لگی۔ میں نے فجر کی نماز پڑھ کر صندوق کو خورجی میں کسا۔ جونہیں دروازہ شہر کا کھُلا، میں شہر میں داخل ہوا ہر ایک آدمی اور دکان دار سے حویلی کرائے کی تلاش کرنے لگا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک مکانِ خوش قطع نیا فراغت کا بھاڑے لے کر جا اُترا۔ پہلے اس معشوق کو صندوق سے نکال کر روئی کے پہلوں پر ملائم بچھونا کر کے ایک گوشے میں لٹایا، اور آدمی اعتباری وہاں چھوڑ کر فقیر جراح کی تلاش میں نکلا۔ ہر ایک سے پوچھتا پھرتا تھا کہ اس شہر میں جراح کاری گر کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟ ایک شخص نے کہا، ایک حجام جراحی کے کسب اور حکیمی کے فن میں پکا ہے، اور اس کام میں نپٹ پکا ہے، اگر مُردے کو اُس پاس لے جاؤ، خُدا کے حُکم سے ایسی تدبیر کرے کہ ایک بار وہ بھی جی اُٹھے۔ وہ اس محلے میں رہتا ہے اور عیسیٰ نام ہے۔

میں یہ مُژدہ سُن کر بے اختیار چلا۔ تلاش کرتے کرتے پتے سے اُس کے دروازے پر پہنچا۔ ایک مردِ سفید ریش کو دہلیز پر بیٹھا

دیکھا اور کئی آدمی مرہم کی تیاری کے لئے کچھ پیس پاس رہے تھے۔ فقیر نے مارے خوشامد کے ادب سے سلام کیا اور کہا، میں تُمھارا نام اور خُو بیاں سُن کر آیا ہوں۔ ماجرا یہ ہے کہ میں اپنے مُلک سے تجارت کے لئے چلا، قبیلے کو بہ سبب محبت ساتھ لیا۔ جب نزدیک اس شہر کے آیا، تھوڑی سی دُور رہا تھا کہ شام پڑ گئی۔ اَن دیکھے مُلک میں رات کو چلنا مناسب نہ جانا۔ میدان میں ایک درخت کے تلے اُتر پڑا۔ پچھلے پہر ڈاکا آیا، جو کچھ مال واسباب پایا لُوٹ لیا، گہنے کے لالچ سے اس بی بی کو بھی گھایل کیا۔ مجھ سے کچھ نہ ہوسکا، رات جو باقی تھی جُوں تُوں کر کے کاٹی، فجر ہی شہر میں آن کر ایک مکان کرائے لیا، اُن کو وہاں رکھ کر میں تمھارے پاس دوڑا آیا ہوں۔ خُدا نے تمھیں یہ کمال دیا ہے، اس مسافر پر مہربانی کرو، غریب خانے تشریف لے چلو، اُس کو دیکھو اگر اس کی زندگی ہوئی تو تمھیں بڑا اجس ہوگا اور میں ساری عمر غلامی کروں گا۔ عیسیٰ جراح بہت رحم دل اور خُدا پرست تھا۔ میری غریبی کی باتوں پر ترس کھا کر میرے ساتھ اُس حویلی تک آیا۔ زخموں کو دیکھتے ہی میری تسلی کی، بولا کہ خُدا کے کرم سے اِس بی بی کے زخم چالیس دن بھر آویں گے، غسل شفا کا کروادوں گا۔

غرض اُس مردِ خُدا نے سب زخموں کو نیم کے پانی سے دھودھا کر صاف کیا۔ جو لائق ٹانکوں کے پائے انھیں سیا، باقی گھاؤں پر اپنی کھیسے سے ایک ڈبیا نکال کر کتنوں میں پٹی رکھی، اور کتنوں پر پھائے چڑھا کر پٹی سے باندھ دیا اور نہایت شفقت سے کہا، میں دونوں وقت آیا کروں گا، تو خبردار رہیو ایسی حرکت نہ کرے جو ٹانکے ٹوٹ جائیں۔ مرغ کا شوربا بجائے غذا اس کے حلق میں چوائیو اور اکثر عرق بید مشک گلاب کے ساتھ دیا کیجیو جو قوت رہے۔ یہ کہ کر رخصت چاہی۔ میں نے بہت منت کی اور ہاتھ جوڑ کر کہا، تمھاری تشفی دینے سے میری بھی زندگی ہوئی، نہیں تو سوائے مرنے کے کچھ سوجھتا نہ تھا، خدا تمھیں سلامت رکھے۔ عطر پان دے کر رخصت کیا میں رات دن خدمت میں اس پری کے حاضر رہتا، آرام اپنے اوپر حرام کیا۔ خدا کی درگاہ سے روز روز اس کے چنگے ہونے کی دعا مانگتا۔ اتفاقاً وہ سوداگر بھی آ پہنچا، اور میرا مال امانت میرے حوالے کیا۔ میں نے اسے اونے پونے بیچ ڈالا، اور دار و درمن میں خرچ کرنے لگا۔ وہ مرد جراح ہمیشہ آتا جاتا، تھوڑے عرصے میں سب زخم بھر کر انگور کر لائے۔ بعد کئی دن کے غسل شفا کیا، عجب طرح کی خوشی حاصل ہوئی۔ خلعت اور اشرفیاں عیسیٰ حجام کے آگے دھریں، اور اس پری کو مکلّف فرش بچھا کر مسند پر بٹھایا۔ فقیر غریبوں کو بہت سی خیر خیرات کی۔ اس دن گویا بادشاہت ہفت اقلیم کی اس فقیر کے ہاتھ لگی، اور اس پری کا شفا پانے سے ایسا رنگ نکھرا کہ مکھڑا سورج کے مانند چمکنے اور کندن کی طرح دمکنے لگا۔ نظر کی مجال نہ تھی جو اس کے جمال پر ٹھہرے۔ فقیر بہ سروچشم اس کے حکم میں حاضر رہتا، جو فرماتی سو بجالاتا۔ وہ اپنے حسن کے غرور اور سرداری کے دماغ میں جو میری طرف کبھو دیکھتی تو فرماتی، خبردار، اگر تجھے ہماری خاطر منظور ہے تو ہرگز ہماری بات میں دم نہ مارئیو، جو ہم کہیں سو بلا عذر کیے جائیو، اپنا کسی بات میں دخل نہ کریو، نہیں تو پچتاوے گا۔ اس کی وضع سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ حق میری خدمت گزاری اور فرماں برداری کا اسے البتہ منظور ہے۔ فقیر بھی اس کی بے مرضی ایک کام نہ کرتا، اس کا فرمانا بہ سروچشم بجالاتا۔

ایک مدت اسی راز و نیاز میں کٹی، جو اس نے فرمائش کی، وونھیں میں نے لا کر حاضر کی۔ اس فقیر پاس جو کچھ جنس اور نقد اصل و نفع کا تھا، سب صرف ہوا۔ اس بیانے ملک میں کون اعتبار کرے جو قرض دام سے کام چلے؟ آخر تکلیف روزمرے کے خرچ کی ہونے لگی، اس سے دل بہت گھبرایا، فکر سے دبلا ہوتا چلا، چہرے کا رنگ کلجھوا ں ہوگیا، لیکن کس سے کہوں؟ جو کچھ دل پر گزری سو گزری، قہر درویش بر جانِ درویش۔ ایک دن اس پری نے اپنے شعور سے دریافت کر کے کہا۔ "اے فلانے! تیری خدمتوں کا حق ہمارے جی میں نش کا لجر ہے۔ پر اس کا عوض بالفعل ہم سے نہیں ہوسکتا۔ اگر واسطے خرچ ضروری کے کچھ درکار ہو تو اپنے دل میں اندیشہ نہ کر، ایک ٹکڑا کاغذ اور دوات قلم حاضر کر۔ میں نے تب معلوم کیا کسی ملک کی پادشاہ زادی ہے جو اس دل و دماغ سے گفتگو کرتی ہے۔ فی الفور قلم دان آگے رکھ دیا۔ اس نازنین نے ایک شقہ دستخط خاص سے لکھ کر میرے حوالے کیا اور کہا، "قلعے کے پاس ترپولیا ہے۔ وہاں اس کوچے میں ایک حویلی بڑی سی ہے۔ اس مکان کے مالک کا نام سیدی بہار ہے۔ تو جا کر اس رقعے کو اس تلک پہنچا دے۔"

فقیر موافق فرمانے اس کے اسی نام ونشان پر منزلِ مقصود تک جا پہنچا۔ دربان کی زبانی کیفیت خط کی کہلا بھیجی۔ وونھیں سنتے ہی ایک ایک حبشی جوان خوب صورت ایک پھینٹا طرح دار سجے ہوئے باہر نکل آیا۔ اگرچہ رنگ سانولا تھا پر گویا تمام نمک بھرا ہوا۔ میرے

ہاتھ سے خط لے لیا، نہ بولا نہ کچھ پوچھا۔ انھیں قدموں پھر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں گیارہ کشتیاں سر بہ مہر زربفت کی تورہ پوش پڑے ہوئے غلاموں کے سر پر دھرے باہر آیا۔ کہا اس جوان کے ساتھ جا کر چوگوشے پہنچا دو۔ میں بھی سلام کر رخصت ہوا اپنے مکان میں لایا آدمیوں کو دروازے کے باہر سے رخصت کیا۔ دو کشتیاں امانت حضور میں اس پری کے گزارانیاں دیکھ کر فرمایا ''یہ گیارہ بدرے اشرفیوں کی لے اور خرچ اور خرچ میں لا خدا رزاق ہے۔'' فقیر اس نقد کو لے کر ضروریات میں خرچ کرنے لگا۔ اگرچہ خاطر جمع ہوئی پر دل میں یہ خلش رہی یا الٰہی! یہ کیا صورت ہے؟ بغیر پوچھے گچھے اتنا مال ناآشنا صورت اجنبی نے ایک پرزے کاغذ پر میرے حوالے کیا، اگر اس پری سے یہ بھید پوچھوں، تو اس نے پہلے ہی منع کر رکھا تھا۔ مارے ڈر کے دم نہیں مار سکتا تھا۔

1.2.2 سیر پہلے درویش کا فنی تجزیہ

یہ واقعہ اُس حصے سے تعلق رکھتا ہے جہاں راوی یعنی پہلا درویش جو ملک یمن کے تاجر خواجہ احمد کا بیٹا تھا اپنے والدین کی موت کے بعد اپنی بہن کے اصرار پر تجارت کے لیے روانہ ہوتا ہے۔

پہلا درویش بتاتا ہے کہ والدین کے انتقال کے بعد اس نے اپنی تمام دولت عیش وعشرت اور جوئے بازی میں لٹا دی حتی کہ اس کی تمام تر دولت ختم ہوگئی۔ تب ایک دن اس کی بہن، جو ماں کی طرح اس سے محبت کرتی تھی، اسے سمجھانے لگی کہ مردوں کے لیے گھر بیٹھنا مناسب نہیں۔ عورت کہتی ہے کہ اگر کوئی مرد بغیر کام کیے گھر میں رہے تو لوگ اسے طعنہ دیتے ہیں، اور یہ ان کی غیرت کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ وہ اسے مشورہ دیتی ہے کہ تجارت کے لیے سفر کرے تاکہ قسمت بدلے اور عزت وخوش حالی حاصل ہو۔ راوی کو بہن کی نصیحت پسند آتی ہے اور وہ کہتا ہے کہ اب تم ہی ماں کی جگہ ہو، جو کہو گی، وہی کروں گا۔

بہن پچاس توڑے اشرفیوں کے دیتی ہے اور کہتی ہے کہ ایک قافلہ دمشق جا رہا ہے، تم بھی اس کے ساتھ چلو، مال خرید کر ایک ایماندار تاجر کے سپرد کر دو۔ پہلا درویش بازار سے تجارت کا سامان خرید کر ایک سوداگر کے حوالے کر دیتا ہے اور خود خشکی کے راستے سے روانہ ہو جاتا ہے۔ رخصتی کے وقت بہن بڑے پیار سے اسے گھوڑا، مٹھائی، پانی، امام ضامن اور دعائیں دے کر رخصت کرتی ہے۔

درویش دو منزلیں طے کر کے دمشق پہنچتا ہے، مگر رات زیادہ ہو جانے کے سبب شہر کے دروازے بند ملتے ہیں۔ وہ منت کرتا ہے کہ دروازہ کھول دیا جائے، مگر دربان انکار کر دیتے ہیں۔ ناچار وہ دیوار کے نیچے گھوڑے سے اتر کر بیٹھ جاتا ہے۔ آدھی رات کے وقت اسے اچانک ایک عجیب منظر نظر آتا ہے۔ قلعے کی دیوار کے اوپر سے ایک صندوق نیچے آ گرتا ہے۔ درویش حیران ہوتا ہے کہ یہ کیا طلسم ہے، مگر تجسس سے صندوق کھولتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اندر ایک نہایت حسین عورت زخمی حالت میں پڑی ہے۔ وہ نیم بے ہوش ہے، جسم لہو میں تر ہے، مگر لبوں پر کسی بے وفا سے شکایت کے الفاظ ہیں۔ فقیر یہ دیکھ کر حیران وافسردہ ہو جاتا ہے اور سوچنے لگتا ہے کہ آخر کس سنگ دل نے ایسے نازک پیکر پر ظلم کیا ہوگا۔ عورت جب اس کی باتیں سنتی ہے تو ایک لمحے کو آنکھ کھول کر اسے دیکھتی ہے اور پھر کمزور آواز میں کہتی ہے کہ میں آخری سانسیں لے رہی ہوں، میری التجا ہے کہ جب میں مر جاؤں تو اسی صندوق میں دفنا دینا تاکہ بدنامی سے بچ جاؤں۔

درویش رات بھر اس کے پاس پہرہ دیتا ہے اور صبح ہوتے ہی شہر میں داخل ہوتا ہے۔ ایک حویلی کرائے پر لے کر عورت کو وہاں رکھتا ہے، اور ایک قابل جراح کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ اسے ''عیسیٰ'' نامی حجام ملتا ہے جو جراحی اور حکمت دونوں میں ماہر ہوتا ہے۔ درویش اس سے اپنی پریشانی بیان کرتا ہے۔ عیسیٰ اس کی حالت پر رحم کھا کر اس کے ساتھ چلتا ہے۔ وہ عورت کے زخموں کو صاف کرتا ہے، ٹانکے لگاتا ہے، مرہم پٹی کرتا ہے اور امید دلاتا ہے کہ چالیس دن میں وہ تندرست ہو جائے گی۔

درویش پوری لگن سے اس کی خدمت میں لگا رہتا ہے۔ وہ اپنی تجارت سے کمائی ہوئی رقم علاج پر خرچ کر دیتا ہے۔ خدا کے فضل سے عورت صحت یاب ہو جاتی ہے اور اس کا حسن پہلے سے بھی زیادہ نکھر جاتا ہے۔ درویش خوشی سے جھوم اٹھتا ہے اور عیسیٰ کو خلعت اور انعام دیتا ہے، اور غریبوں میں خیرات بانٹتا ہے۔ عورت اب ایک باوقار اور نازک مزاج شخصیت بن جاتی ہے۔ وہ درویش کو تنبیہ کرتی

ہے کہ اگر میری خدمت کرنا چاہتا ہے تو بس میرے حکم کے مطابق چلنا، کوئی بات نہ ٹوکنا ورنہ پچھتائے گا۔ درویش جواب اس کے حسن و جمال اور وقار کا اسیر ہو چکا ہوتا ہے اس کے ہر حکم پر سر جھکاتا ہے۔

وقت گزرتا ہے، درویش کی ساری جمع پونجی آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے۔ غربت اور فکر کے باعث اس کا چہرہ زرد پڑ جاتا ہے۔ عورت کو اس کی پریشانی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اسے تسلی دے کر ایک رقعہ لکھتی ہے اور کہتی ہے کہ اسے ایک شخص 'سیدی بہار' کے پاس پہنچا دو۔ درویش اس کے حکم کے مطابق وہاں جاتا ہے۔ خط دے کر واپس آتا ہے تو ایک حسین حبشی جوان اشرفیوں کے گیارہ بند صندوق لے کر آتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ تمہارے لیے ہیں۔ درویش حیران ہوتا ہے کہ ایک اجنبی نے اتنا مال بغیر کسی بات چیت کے کیسے دے دیا، مگر چونکہ عورت نے منع کر رکھا تھا کہ کسی بات کی تحقیق نہ کرنا اس لئے وہ خاموش رہتا ہے۔

یوں تاجر کے بیٹے کی قسمت ایک بار پھر پلٹنے لگتی ہے، لیکن کہانی یہاں ایک نئے راز کے دروازے کھول دیتی ہے۔ اس پری چہرہ کی حقیقت، سیدی بہار سے اس کا رشتہ، اور اس دولت کے پس منظر میں چھپے قصے کا اب تک کھلنا باقی رہتا ہے۔

یہ داستانی اقتباس ایک روایتی داستانی ڈھانچے پر مبنی ہے جہاں حیرت انگیز واقعات رونما ہوتے ہیں۔ ابتدا میں سببِ سفر' (بہن کی نصیحت)، پھر حادثہ (صندوق کا گرنا)، اس کے بعد کرب و کشمکش (عورت کی بیماری اور علاج)، اور آخر میں عارضی نجات (عورت کی صحت و دولت کا حصول) یہ سب عناصر ایک منظّم اور مربوط قصے کی صورت ہمارے سامنے آتے ہیں۔ پلاٹ میں بیک وقت حیرت، تجسس اور اخلاقی سبق موجود ہیں۔

پہلے درویش کی سیر کے دوران کئی اہم کردار سامنے آتے ہیں جو قصے کے ارتقا میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ پہلا کردار درویش کا ہے جو انسانیت، شرافت، اور صبر و قربانی کی علامت ہے۔ اس کے کردار میں سادگی اور ایثار نمایاں ہے۔ دوسرا اہم کردار اس کی بہن کا ہے جو مشرقی عورت کی عقل و فہم اور محبت کا نمونہ ہے۔ اس کی نصیحت اخلاقی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ تیسرا اہم کردار اس اجنبی زخمی عورت کا ہے جو حسن و رمز کی علامت ہے۔ اس کے کردار میں ناز، غرور، راز داری، اور ایک پوشیدہ دکھ جھلکتا ہے۔ اس کے علاوہ عیسیٰ جراح کا کردار بھی انسانی خدمت اور علم کا مظہر ہے نیز وہ مذہبی اور اخلاقی اعتبار سے بھی ایک اہم کردار ہے۔

قصے کی زبان و بیان بے حد دلچسپ اور پر لطف ہے۔ یہ عبارت باغ و بہار کی نمایاں خوبیوں کا مظہر ہے۔ زبان نہایت شستہ، رواں اور محاوراتی ہے۔ میر امن دہلوی نے دہلی کی روزمرہ اردو کو نثر میں اس طرح برتا کہ وہ قدرتی گفتگو کا سا لطف دیتی ہے۔ تشبیہات اور استعارات اعتدال کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ مذکورہ متن میں ہم قدیم دلی کی زبان کے کئی متروک اور رائج محاوروں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ میر امن نے داستان گوئی کے قدیم رنگ کو سادہ نثر میں پیش کیا۔ مکالمے فطری ہیں، منظر نگاری تصویری انداز میں ہے، اور بیانیہ میں جذباتی روانی برقرار ہے۔ نثر میں کہیں وعظ اور کہیں رومانیت جھلکتی ہے۔

کہانی کی فضا خوابناک اور رمز آلود ہے۔ صندوق کا گرنا، زخمی حسین عورت، حبشی قاصد کا آنا یہ سب فسانوی فضا کو جنم دیتے ہیں۔ اس کے باوجود جذباتی سچائی کہانی کو حقیقی تاثر دیتی ہے۔ داستان کے اس حصے کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ محنت اور عزت کے ساتھ زندگی گزارنا ہی مردانگی ہے، اور خدمت، وفا، اور صبر انسان کو بلند کرتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ سبق بھی دیا گیا ہے کہ زندگی کے راز ہر شخص پر نہیں کھلتے، بعض بھید وقت کے ساتھ ہی انسان پر آشکار ہوتے ہیں اور اسی میں انسان کی بھلائی پوشیدہ ہوتی ہے۔

خود اکتسابی کے لیے سوالات I

خالی جگہیں پُر کیجیے۔

1۔ والدین کے انتقال کے بعد اس نے اپنی تمام دولت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میں لٹا دی۔

2۔ پہلا درویش بازار سے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کا سامان خرید کر ایک ۔۔۔۔۔۔۔۔ کے حوالے کر دیتا ہے۔

3۔ قلعے کی دیوار کے اوپر سے ایک ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نیچے آ گرتا ہے۔
4۔ وقت گزرتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کی ساری۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے۔
5۔ کہانی کی فضا خوابناک اور۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔

1.2.3 زبان کی مہارتیں (پڑھنے کی مہارت کے حوالے سے)

پڑھنے کی مہارت (Reading Skill) زبان سیکھنے اور علم حاصل کرنے کی بنیادی صلاحیتوں میں سے ایک ہے۔ یہ نہ صرف تعلیمی ترقی کے لیے ضروری ہے بلکہ روزمرہ زندگی میں سمجھ بوجھ، رابطہ اور فکر کی وسعت کے لیے بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ پڑھنے کے ذریعے انسان دنیا بھر کے خیالات، تجربات اور معلومات تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ کتابیں، رسائل، اخبارات اور آن لائن مواد سب علم کے خزانے ہیں جو پڑھنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ اسی طرح کلاسیکی متون کا باقاعدہ مطالعہ نہ صرف ذہن کو متحرک رکھتا ہے بلکہ یہ سوچنے اور سمجھنے کی قوت میں بھی اضافہ کرتا ہے۔ یہ تخیل کو وسعت دیتا ہے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت بہتر بناتا ہے۔ قدیم داستانیں پڑھنے سے الفاظ کا ذخیرہ بڑھتا ہے، جملے بنانے کا انداز بہتر ہوتا ہے اور زبان کے صحیح استعمال کی سمجھ پیدا ہوتی ہے۔

'باغ و بہار' اردو نثر کی کلاسیکی تصنیف ہے جو نہ صرف اردو ادب کی زندہ جاوید داستان ہے بلکہ زبان، کردار اور واقعات کے ذریعے قاری کی ذہنی و فکری تربیت بھی کرتی ہے۔ پیش کردہ متن جس میں راوی اپنی بہن کی نصیحت پر سفر کرتا ہے، دمشق پہنچتا ہے، ایک زخمی عورت سے ملتا ہے اور پھر اس واقعے سے اس کی زندگی کا رخ بدل جاتا ہے، پڑھنے والے کے لیے ایک ایسا متنی تجربہ ہے جو فہم، تجزیہ، تخیل اور زبان کی حس کو بیدار کرتا ہے۔ اس تحریر کو پڑھنے کی مہارت یعنی Reading skill کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ کئی سطحوں پر قاری کی ذہانت اور زبان کی گرفت کو آزماتی ہے۔

سب سے پہلی سطح 'فہمِ متن' کی ہے، جس میں قاری الفاظ اور واقعات کو ظاہری طور پر سمجھتا ہے۔ اس اقتباس میں کہانی کی ترتیب سادہ مگر پرکشش ہے۔ ایک عام واقعہ جیسے سفر یا صندوق کا گرنا قاری کو تجسس میں مبتلا رکھتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پڑھنے والا الفاظ سے معنی اخذ کرنے اور واقعات کے تسلسل کو سمجھنے کی صلاحیت حاصل کرتا ہے۔ یہاں ہر منظر کا بیان، کرداروں کے اعمال، اور ان کے رویّے، قاری کے ذہن میں ایک تصویری سلسلہ بناتے ہیں جو پڑھنے کی لذت کو بڑھاتا ہے۔

دوسری سطح ترسیلی یا اشاراتی فہم کی ہے۔ قاری محض یہ نہیں دیکھتا کہ کیا ہوا بلکہ یہ بھی سمجھنے کی کوشش کرتا ہے کہ کیوں ہوا۔ بہن کی نصیحت میں اُس دور کی سماجی اقدار جھلکتی ہیں کہ مرد کو غیرت، خودداری اور محنت کا پیکر سمجھا جاتا تھا۔ زخمی عورت کا اچانک نمودار ہونا تقدیر کی علامت ہے، اور اس کے ذریعے انسانی ہمدردی، ایثار اور اخلاقی رویّوں کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔ اس طرح قاری واقعات کے پیچھے چھپے ہوئے معانی کو سمجھنے لگتا ہے جو دراصل پڑھنے کی اعلیٰ ترین مہارت ہے۔

اسی کے ساتھ قاری تنقیدی شعور کا بھی استعمال کرتا ہے۔ وہ یہ سوال اٹھاتا ہے کہ کیا بہن کی نصیحت میں مردانہ غیرت کا تصور پوشیدہ تھا یا محض معاشرتی دباؤ؟ کیا عورت کا کردار واقعی بے بس ہے یا وہ اپنے اعمال سے کہانی کی سمت خود متعین کر رہی ہے؟ ایسے سوالات قاری کے ذہن میں متن کے گہرے تجزیے کے در وا کرتے ہیں۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں پڑھنے والا محض کہانی نہیں پڑھتا بلکہ اس پر غور کر کے اپنی رائے قائم کرتا ہے۔

متن کا ایک اور اہم پہلو اس کی تخیلاتی قوت ہے۔ میر امن نے ایسے مناظر تخلیق کیے ہیں جو قاری کے ذہن میں زندہ ہو جاتے ہیں۔ دمشق کی فصیل، رات کا سکوت، صندوق کا گرنا، زخمی عورت کا لہو میں تر جسم۔ یہ سب منظر قاری کو محسوس کراتے ہیں کہ وہ خود کہانی کا حصہ ہے۔ اس سطح پر پڑھنے والا الفظوں کے ذریعے تصویری اور جذباتی تجربہ حاصل کرتا ہے جو مطالعے کو محض معلوماتی نہیں بلکہ تخلیقی عمل بنا

دیتا ہے۔

اب اگر منتخبہ متن کو لسانی حوالے سے دیکھا جائے تو اس میں اردو نثر کی تمام نمایاں خوبیاں جلوہ گر ہیں۔ زبان سادہ مگر پر اثر ہے، جملے مختصر اور رواں ہیں، جن میں محاورے اور روزمرہ کی روانی موجود ہے۔ الفاظ میں ایک خاص موسیقیت ہے جو داستانی نثر کا وصف ہے۔ کرداروں کی گفتگو میں فطری پن، جذبہ اور تہذیبی شائستگی پائی جاتی ہے۔ اسلوب میں جذبات، اخلاق اور حقیقت نگاری کا حسین امتزاج ہے۔ بیانیہ میں تسلسل اور فصاحت ہے جو قاری کو کہانی کے بہاؤ سے جوڑے رکھتی ہے۔ لسانی اعتبار سے یہ متن اردو نثر کے ارتقائی مرحلے کی نمائندگی کرتا ہے، جہاں زبان میں فصاحت کے ساتھ ساتھ سادگی اور اثر آفرینی بھی موجود ہے۔

پڑھنے کی مہارت کے لحاظ سے یہ اقتباس طلبہ اور قارئین دونوں کے لیے مثالی ہے، کیونکہ یہ نہ صرف واقعاتی فہم کی مشق کراتا ہے بلکہ قاری کو غور و فکر، قیاس اور تجزیے کی طرف مائل کرتا ہے۔ یہ قاری کو زبان کے ذائقے، جملوں کی ساخت، محاوراتی رنگ اور اخلاقی پہلوؤں کا شعور بخشتا ہے۔ اس کے مطالعے سے قاری نہ صرف زبان کی لطافت کو سمجھتا ہے بلکہ انسانی رشتوں، اخلاقی اقدار اور زندگی کی حقیقتوں پر بھی غور کرنے لگتا ہے۔

مذکورہ متن کو ہم مطالعے کی سطحوں (Reading comprehension levels) کے حوالے سے دیکھیں تو ہمیں اس میں لفظی/سطحی فہم مثلاً: بہن کا مشورہ، راوی کا سفر، دمشق پہنچ کر صندوق سے زخمی عورت ملنا، جراح عیسیٰ کا علاج، عورت کی شفایابی اور اس کے احسان کا راز کی عمدہ مثالیں نظر آتی ہیں۔ قاری واقعہ، ترتیبِ واقعات اور واضح حقائق سمجھتا ہے۔ اسی طرح استنباطی/استدلالی فہم کے بھی عمدہ نمونے نظر آتے ہیں۔ یعنی متن میں صریح طور پر نہ کہی گئی باتیں اخذ کرنا: عورت کا شاہی یا معزز پس منظر، بہن کی نصیحت میں معاشرتی دباؤ، راوی کی اخلاقی کیفیت وغیرہ۔

متن میں موجود عربی و فارسی کے مطالعے سے قاری کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے۔ مثلاً اشرفی، حویلی، معشوق، فجر، ناصح، اقدس وغیرہ۔ یہ کتاب سادہ، عام فہم اور دہلی کے روزمرہ میں لکھی گئی ہے جو قاری کو رواں اور آسان محسوس ہوتی ہے۔ یہ متنی رنگ نکھارتے ہیں اور کلاسیکی اردو کے خصائص ہیں۔ متن میں جملہ بندی و نحو (Syntax) کی مثالوں سے قاری کی فہم میں اضافہ ہوتا ہے۔ کیونکہ عبارت میں طویل مرکب جملے عام ہیں مثلاً

''یہ بات سُن کر مجھے بھی غیرت آئی، اس کی نصیحت پسند کی۔ جواب دیا، اچھا اب تم ماں کی جگہ ہو، جو کہو سو کروں۔'' یہاں آزادانہ مکالمے اور ضمیری حوالے ملے ہوئے ہیں؛ قاری کو ضمیروں کی طرف دھیان دینا پڑتا ہے جیسے تم، وہ، میں۔ میر امن نے متن میں ضمائر کثرت سے استعمال کیے ہیں۔ جو جملے کے تسلسل کو برقرار رکھتے ہیں مگر کبھی کبھی مرجع مبہم ہو جاتا ہے (مثلاً'' وہ'' کئی جگہ مختلف مراد رکھتا ہے) اور قاری کو سابقہ جملے سے ریفرنس ملانا پڑتا ہے۔

باغ و بہار کے متن کی قرات کے دوران طلبہ کے پڑھنے کی مہارت میں کئی زاویوں سے اضافہ ہوتا ہے۔ اس میں روایتی محاورات اور اصطلاحات کا کثرت سے استعمال ہوا ہے نیز تہذیبی اصطلاحات بھی جا بجا نظر آتی ہیں:'' کلیجہ ٹھنڈا ہونا، دو منزل کی ایک منزل کرنا، بسر و چشم بجالانا، پچاس توڑے اشرفی، زین پوش، شقہ، زِربفت، تورہ پوش وغیرہ۔ یہ الفاظ اور محاورات قاری کو ایک روایتی فضا میں لے جاتے ہیں۔

آخر میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ متن پڑھنے کی تمام بنیادی صلاحیتوں فہم، استنباط، تنقید، تخیل، اور لسانی شعور کو بیدار کرتا ہے۔ قاری اس کے ذریعے نہ صرف زبان کی خوبیوں کو سمجھتا ہے بلکہ اس میں چھپے انسانی جذبوں اور اخلاقی پیغام کو بھی محسوس کرتا ہے۔ یہی کسی اچھے مطالعے اور مؤثر نثر کا کمال ہے کہ وہ پڑھنے والے کو الفاظ کے دائرے سے نکال کر معنی کے جہان میں لے جاتی ہے۔

1.2.4 قواعد(اسم،ضمیر)

اسم کی تعریف

اس لفظ کو کہتے ہیں جو کسی شخص، جگہ، چیز، صفت یا حالت کے نام کو ظاہر کرے۔اسم وہ کلمہ ہے جس کسی کی شناخت ظاہر ہو۔مثلا: علی، فاطمہ،لکھنؤ، حیدرآباد،قلم، میز، دوات اور آم وغیرہ۔معنی کے اعتبار سے اسم کی دو قسمیں ہیں۔اسم معرفہ اور اسم نکرہ۔

اسم معرفہ: وہ اسم ہے جو کسی خاص شخص، مقام یا شئے کے نام کو ظاہر کرے۔مثلا: اکبر، آگرہ، گلاب، امردو، دلی وغیرہ۔

اسم نکرہ: وہ اسم ہے جو کسی عام شخص مقام یا شئے کے نام کو ظاہر کرے۔اسم نکرہ کو اسم عام بھی کہتے ہیں۔مثلا: شہر، لڑکا، پھول، جانور وغیرہ۔

ضمیر کی تعریف

ضمیر اس لفظ کو کہتے ہیں جو اسم (نام) کی جگہ استعمال ہوتا کہ بار بار نام دہرانے کی ضرورت نہ پڑے۔یعنی ضمیر وہ لفظ ہے جو کسی شخص، چیز یا جماعت کی طرف اشارہ یا حوالہ دیتا ہے۔مثلا: وہ، یہ، تم، ہم، آپ وغیرہ۔ضمیر کی عام طور پر تین بنیادی اقسام ہوتی ہیں۔

ضمیر متکلم: وہ ضمیر جو بولنے والے (First person pronoun) کی طرف اشارہ کرے۔مثلا میں، ہم، ہمارا، میرا۔

ضمیر مخاطب: جس سے بات کی جارہی ہو (econd Peron Pronoun) اس کی طرف اشارہ کرنے والے لفظ کو ضمیر کہتے ہیں۔مثلا: تو، تم، آپ، تیرا، تمہارا۔

ضمیر غائب: جس کے بارے میں بات کی جارہی ہو (Third Person Pronoun) اس کی طرف اشارہ کرنے والے لفظ کو ضمیر غائب کہتے ہیں۔مثلا: یہ، وہ، اس، ان۔

نصاب میں شامل 'سیر پہلے درویش کی' کا متن قواعد کے لحاظ سے بھی بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ہم متن کے اس منتخب حصے کو اسم اور ضمیر کے حوالے سے دیکھتے ہیں تو ہمیں بے شمار مثالیں نظر آتی ہیں۔

متن میں ملنے والے اسم (اہم اسمات، نمایاں اشیاء/ افراد/ مفاہیم)

بہن، والدہ، آنکھ، پُتلی، ماں، باپ، مٹی، نشانی، کلیجا، سفر، مرد، خدا، گھر، دنیا، لوگ، شہر، آدمی، دولتِ دُنیا، بہنوئی، بے غیرتی، چمڑا، جوتیاں، نصیحت، مرضی، اشرفی، لونڈی، قافلہ، سوداگر/ سوداگروں، دمشق، روپے، جنس، تجارت، تاجر، دستاویز، مال، منافع، بازار، اسبابِ سوداگری، سوداگر، نوشت وخواند، فقیر، خشکی، رخصت، سری پاؤ، گھوڑا، تواضع، مٹھائی، پکوان، دان، چھاگل، پانی، شکار، امام ضامن، روپیہ، بازو، دہی، ٹیکا، ماتھا، آنسو، فاتحہ، اللہ حافظ، گھوڑے، توکل، منزل، دروازہ، دربان، نگاہ بان، کواڑ، دانے، گھاس، زین، پوش، آدھی رات، صندوق، قلعہ، دیوار، خزانہ، غیب، کاٹھ، معشوق، عورت، آنکھیں، ہونٹ، آواز، زخم، دوپٹہ، آنچل، بازگشت وغیرہ۔

اسی طرح مذکورہ متن میں ضمیر کی مثالیں بھی کثرت سے نظر آتی ہیں۔ذیل میں نمائندہ ضمائر، ان کی مثالیں اور حوالے دیئے جارہے ہیں۔

ضمیر 'میں' کی مثال: ''میں نے فاتحہ خیر کی پڑھ کر کہا''۔(قاریہ/ بیانیہ میں مرکزی راوی/ کردار کی اپنی پہلی شخصی گفتگو)

ضمیر 'وہ' کی مثال: ''وہ بہن جو بجائے والدہ کے میری خاطر رکھتی تھی۔'' (نامزد شخصیت یعنی بہن کے لیے اشارہ)

ضمیر 'میری/ میرا' کی مثالیں: ''میری خاطر''، ''میرا کلیجا''۔(متکلم/ راوی کا ملکیتی/ احساسی حوالہ)

ضمیر 'تو/ تیرے/ تجھے/ تم/ تمھارے/ تمھیں/ تمھارا' کی مثالیں: ''اے بیرن! تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی موئی مٹی کی نشانی ہے۔تیرے آئے سے میرا کلیجا ٹھنڈھا ہوا۔جب تجھے دیکھتی ہوں دل باغ باغ ہوتی ہوں۔تو نے مجھے نہال کیا۔ان سطروں میں

بہن ے درویش کومختلف ضمائر سے مخاطب کیا ہے۔ یہ الفاظ درویش اور دوسرے مخاطبین کے لیے قریبی، غیر رسمی خطاب اور تعلق کی شدت دکھاتے ہیں۔

ضمیر 'اس/ اس/ اس کی' مثالیں: ''اُس کو دُنیا کے لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں، خصوصا اس شہر کے آدمی۔'' اس جملے میں ضمیر غائب کے عمدہ نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔

اسی طرح متن میں ضمائر مختلف حوالہ جات کے لئے استعمال ہوئے ہیں۔ اس سے کرداروں کے تعلق کی وضاحت بھی ہوتی ہے۔ مثلا: تو/تم/ تیرے/ تجھے قریبی، رومانی یا جذباتی خطاب کے طور پر آیا ہے، خصوصا پہلے درویش اور اس کی بہن کی گفتگو میں۔ یہ بولنے والی بہن کے احساس اور مخاطب کے مقام کو واضح کرتا ہے۔ یہ ضمائر تعلقِ قرب اور کبھی تنبیہ دونوں ظاہر کرتے ہیں۔

میں/ میری/ میرا بیانیہ کے مرکز یعنی راوی یا مرکزی کردار کے ذاتی خیالات وافعال کو ظاہر کرتا ہے۔ اس سے داستانی زاویۂ نگاہ (First person narrator) نمایاں ہوتا ہے۔

قواعد اسم وضمیر کے حوالے سے اس متن کی لسانی اور ادبی اہمیت بھی واضح ہے۔ بعض ضمائر رشتوں اور جذبات کی شدت کا اظہار کرنے کا وسیلہ بنتے ہیں۔ مثلا: ضمائرِ مخاطب (تو، تم، تیرے، تجھے) کا بار بار آنا بولنے والے اور مخاطب (درویش) کے درمیان قربت، چاہ، ملامت اور حفاظت کے جذبات کو مؤثر انداز میں دکھاتا ہے۔ مثال کے طور پر ''تو میری آنکھوں کی پُتلی'' میں 'تو' محبت و اپنائیت کا اظہار ہے۔

اس وضمیر کی روشنی میں اس عہد کے روایتی سماجی ڈھانچے اور صنفی کرداروں کی جھلک بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ مثلا: اسمات جیسے 'مرد، 'گھر'، 'بہنوئی'، 'لونڈی' 'چھاگل' وغیرہ معاشرتی توقعات، شرعی/سماجی فرائض اور غربت/عزت کے مسائل کو سامنے لاتے ہیں۔ متن میں اسمات سے واضح ہوتا ہے کہ معاشرہ کس طرح مرد سے روزگار کی امید رکھتا ہے اور عورتوں کے لیے کیا خیالات رائج تھے۔

باغ و بہار کے متن میں قریبی اور رسمی خطاب کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ سیر پہلے درویش کے اس منتخبہ متن میں 'تو/تم' کے ساتھ ساتھ 'آپ' کا بھی استعمال ملتا ہے۔ یہ صنفی، سماجی یا موقع کے مطابق بولنے کے انداز میں تبدیلی دکھاتا ہے۔ ان ضمائر سے ظاہر ہوتا ہے کہ کردار کبھی نرمی سے گفتگو کررہے ہیں تو کبھی باادب مشورہ دے رہے ہیں۔ لسانی طور پر یہ حوالہ بہت قیمتی ہے کیونکہ اس سے بولنے والوں کے تعلقات اور معاشرتی حیثیت واضح ہوتی ہے نیز ضمائر کی یہ تبدیلی متن کو جذباتی اور سماجی دونوں طور پر فعال رکھتی ہے۔

اسی طرح متن میں بہت سی ٹھوس اشیاء (چمڑے کی جوتیاں، صندوق، گھوڑا، روپیہ، جہاز) اور تجریدی اصطلاحات (غیرت، مفلسی، ہمدردی) پائی جاتی ہیں۔ اسم کی یہ کثرت قاری کو منظر اور سماجی حقیقت دونوں دکھاتی ہے۔ اسموں کا یہ تنوع (منفرد و مرکب اسمات) عبارت کو کلاسیکی اور روایتی رنگ دیتا ہے، جو اردو کی داستانوی روایت کا ایک جزو ہے۔

خود اکتسابی کے لیے سوالات II

صحیح یا غلط کی نشاندہ کیجیے۔

1۔ کلاسیکی متون کا مطالعہ نہ صرف ذہن کو متحرک رکھتا ہے بلکہ یہ سوچنے اور سمجھنے کی قوت میں بھی اضافہ کرتا ہے۔ (صحیح یا غلط)

2۔ باغ و بہار اردو نثر کی جدید تصنیف ہے۔ (صحیح یا غلط)

3۔ اگر منتخبہ متن کو لسانی حوالے سے دیکھا جائے تو اس میں اردو نثر کی تمام نمایاں خوبیاں جلوہ گر ہیں۔ (صحیح یا غلط)

4۔ اسم وہ لفظ ہے جو کسی شخص، چیز یا جماعت کی طرف اشارہ یا حوالہ دیتا ہے۔ (صحیح یا غلط)

5۔ متن میں ضمائر مختلف حوالہ جات کے لئے استعمال نہیں ہوئے ہیں۔ (صحیح یا غلط)

1.3 الفاظ اور معنی

الفاظ	معنی
اسباب	ساز وسامان، وسائل
استنباط	معلوم بات سے نامعلوم بات دریافت کرنے کا عمل
اصیل لونڈی	خالص نسل کی خادمہ، شریف نوکرانی
امام ضامن	منت کا سکہ جو حفاظت کے لئے بازو میں باندھا جاتا ہے
پچاس توڑے اشرفی	پچاس ہزار سونے کے سکے
تنوع	اقسام
تورہ پوش	خوان کا سرپوش، خوان پوش
جراح	نشتر لگا کر مرہم رکھنے والا، سرجن
جزو	حصہ
چھاگل	مشکیزہ، چمڑے کی تھیلی جس میں پانی رکھا جاتا تھا
حبشی	سیاہ فام، افریقی
خاص دان	پان کی گلوری رکھنے کا برتن
خاطر جمع	اطمینان، تسلی
خلعت	شاہی لباس
خوش قطع	اچھی شکل والا، سڈول
درویش	فقیر، صوفی منش
دھاوا مارنا	حملہ کرنا
راز و نیاز	سرگوشیاں، پوشیدہ باتیں
زربفت	سونے چاندی اور ریشم سے بنا ہوا کپڑا
زین پوش	زین کے اوپر الٹنے کا کپڑا
نوشت وخواند	لکھنا پڑھنا
طلسم	جادو، ٹونا، شعبدہ گری
رمز	اشارہ
سدھارنا	سیدھا کرنا، تربیت دینا
سربہ مہر	بند کیا ہوا، جس پر مہر لگائی گئی ہو
سفید ریش	سفید داڑھی والا
سیر	چہل قدمی
شقہ	چٹھی، خط، پرچہ
صریح	صاف، واضح

فعال	متحرک
قرب	نزدیکی
کاٹھ	لکڑی
کسب	ہنر،فن، پیشہ
کلجھواں	سانولا
متروک	چھوڑا ہوا،ترک کیا ہوا
مژدہ	خوش خبری
مظہر	نشانی، دلیل
منظّم	ترتیب دیا ہوا
نہال کرنا	خوش کرنا

1.4 خوداکتسابی سوالات کے جوابات

I

1۔عیش وعشرت
2۔تجارت،سوداگر
3۔صندوق
4۔درویش،جمع پونجی
5۔رمزآلود

II

1۔صحیح
2۔غلط
3۔صحیح
4۔غلط
5۔غلط

1.5 خلاصہ

اردوادب کی دنیامیں داستان ایک قدیم اوردل چسپ نثری صنف ہے۔داستان اس طویل قصے کو کہتے ہیں جس میں غیر معمولی

واقعات، مہم جوئی، جادو، کرشمے اور ہیرو کی بہادری کا بیان ہوتا ہے۔ اس کا مقصد صرف تفریح نہیں بلکہ اخلاقی، تہذیبی اور معاشرتی پیغام دینا بھی ہوتا ہے۔ ان داستانوں نے اردو نثر کو ایک نیا رنگ اور فصاحت عطا کی ہے۔ اردو کی مشہور داستانوں میں سب رس، قصہ مہر افروز ودلبر، رانی کیتکی کی کہانی، آرائش محفل، طوطا کہانی اور باغ و بہار کے نام شامل ہیں۔

ان داستانوں میں 'باغ و بہار' کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ یہ مشہور داستان 'میر امن دہلوی' نے 'نوطرز مرصع' سے ماخوذ لی ہے۔ اس داستان کو ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی تحریک پر فورٹ ولیم کالج کے لیے لکھا گیا۔ اس کا اصل ماخذ فارسی 'قصہ چہار درویش' ہے۔ باغ و بہار نہ صرف اپنی دلچسپ کہانی بلکہ سادہ اور سلیس زبان کے سبب اردو نثر کا سنگِ میل سمجھی جاتی ہے۔

کہانی کا آغاز ایک بادشاہ آزاد بخت سے ہوتا ہے جو ایک دن اپنی سلطنت اور زندگی سے بیزار ہو کر سب کچھ چھوڑ کر نکل پڑتا ہے۔ راستے میں اسے چار درویش ملتے ہیں، جو اپنی عبرت انگیز اور دردناک کہانی سناتے ہیں۔ ان کہانیوں میں محبت، قربانی، وفاداری اور قسمت کے رنگ نمایاں ہیں۔ آخر میں تمام کردار اپنی آزمائشوں سے نکل کر خوشی و کامیابی پاتے ہیں، اور اس طرح ایک روایتی طریقے سے داستان کا اختتام ہوتا ہے۔ یہ داستان محض تفریح یا وقت گزاری کے لئے نہیں لکھی گئی بلکہ اس میں انسانیت، ایثار اور ہمدردی کا سبق پوشیدہ ہے۔ اس کے کرداروں دکھ سکھ اور زندگی کی حقیقتوں کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ میر امن نے اسے عام فہم زبان میں بیان کیا، جس سے اردو نثر میں سادگی، روانی اور شگفتگی پیدا ہوئی۔ اس قصے کے محاوراتی اسلوب میں ہم دہلی کی تہذیب و معاشرت کے نمونے بھی دیکھ سکتے ہیں۔

باغ و بہار جیسی کلاسیکی داستانیں پڑھنے سے نہ صرف زبان بہتر ہوتی ہے بلکہ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ پڑھنے کی مہارت انسان کے علم، شعور اور کردار کو سنوارتی ہے۔ یہ مہارت ذہنی نشوونما، زبان دانی، توجہ اور تجزیاتی سوچ کو فروغ دیتی ہے۔

داستان اردو نثر کی بنیادی اصناف میں ایک ہے اور باغ و بہار اس بنیاد کی خوبصورت مثال ہے۔ اسی طرح پڑھنے کی مہارت وہ زینہ ہے جس کے ذریعے ہم ان داستانوں کے معنی، پیغام اور حسن کو سمجھ سکتے ہیں۔ یہ تینوں چیزیں—ادبی شعور، زبان کی ترقی اور فکری وسعت—انسانی زندگی کے تعلیمی و اخلاقی پہلوؤں کو سنوارنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

1.6 خود اکتسابی کے لئے مشق

تحریری سرگرمیاں

دیئے گئے اقتباس میں اسم، ضمیر، روزمرہ اور محاوروں کی شناخت کریں۔

ایک دن وہ بہن جو بجائے والدہ کے میری خاطر رکھتی تھی، کہنے لگی، اے بیرن! تو میری آنکھوں کی پُتلی اور ماں باپ کی موئی مٹی کی نشانی ہے۔ تیرے آنے سے میرا کلیجا ٹھنڈا ہوا۔ جب تجھے دیکھتی ہوں، باغ باغ ہوتی ہوں۔ تو نے مجھے نہال کیا، لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لیے بنایا ہے گھر میں بیٹھے رہنا اُن کو لازم نہیں۔ جو مرد نکھٹو ہو کر گھر سیتا ہے، اُس کو دُنیا کے لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں، خصوصاً اس شہر کے آدمی چھوٹے بڑے بے سبب تمھارے رہنے پر کہیں گے، اپنے باپ کی دولتِ دُنیا کھو کھا کر بہنوئی کے ٹکڑوں پر آ پڑا۔ یہ نہایت بے غیرتی اور میری تمہاری ہنسائی اور ماں باپ کے نام کو سبب لاج لگنے کا ہے۔ نہیں تو میں اپنے چمڑے کی جوتیاں بنا کر تجھے پہناؤں اور کلیجے میں ڈال رکھوں۔ اب یہ صلاح ہے کہ سفر کا قصد کرو۔ خدا چاہے تو دن پھریں اور اس حیرانی و مفلسی کے بدلے خاطر جمعی اور خوشی حاصل ہو۔ یہ بات سُن کر مجھے بھی غیرت آئی، اس کی نصیحت پسند کی۔ جواب دیا، اچھا اب تم ماں کی جگہ ہو، جو کہو سو کروں۔ یہ میری مرضی پا کر گھر میں جا

کے پچاس توڑے اشرفی کے اصیل لونڈیوں کے ہاتھوں میں لوا کر میرے آگے لا رکھے اور بولی ایک قافلہ سوداگروں کا دمشق کو جاتا ہے، تم ان روپوں سے جنس تجارت کی خرید کرو۔ ایک تاجر ایماندار کے حوالے کر کے، دستاویز پکی لکھوالو، اور آپ بھی قصد دمشق کا کرو۔ وہاں جب خیریت سے جا پہنچو، اپنا مال مع منافع سمجھ بوجھ لیجیو یا آپ بیچیو۔ میں وہ نقد لے کر بازار میں گیا، اسباب سوداگری کا خرید کر ایک بڑے سوداگر کے سپرد کیا۔ نوشت وخواند سے خاطر جمع کر لی۔ وہ تاجر دریا کی راہ سے جہاز پر سوار ہو کر ورانہ ہوا۔ فقیر نے خشکی کی راہ چلنے کی تیاری کی۔ جب رُخصت ہونے لگا، بہن نے ایک سری پاؤ بھاری اور ایک گھوڑا جڑاؤ ساز سے تواضع کیا، اور مٹھائی پکوان ایک خاص دان میں بھر کر ہرنے سے لٹکا دیا، اور چھاگل پانی کی شکار بند میں بندھوادی۔ امام ضامن کا روپیہ میرے بازو پر باندھا، دہی کا ٹیکا ماتھے پر لگا کر آنسو پی کر بولی، سدھارو! تمھیں خدا کو سونپا، پیٹھ دکھائے جاتے ہو، اسی طرح جلد اپنا منہ دکھائیو۔ میں نے فاتحہ خیر کی پڑھ کر کہا، تمھارا بھی اللہ حافظ ہے۔ میں نے قبول کیا۔ وہاں سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہوا، اور خدا کے توکل پر بھروسہ کر کے دو منزل کی ایک منزل کرتا ہوا دمشق کے پاس جا پہنچا۔

کام کا تجربہ

دیئے گئے اردو جملوں کا انگریزی میں ترجمہ کریں:

1۔ مردوں کو خدا نے کمانے کے لیے بنایا ہے گھر میں بیٹھے رہنا اُن کو لازم نہیں۔
2۔ یہ بات سُن کر مجھے بھی غیرت آئی، اس کی نصیحت پسند کی۔
3۔ ایک قافلہ سوداگروں کا دمشق کو جاتا ہے، تم ان روپوں سے جنس تجارت کی خرید کرو۔
4۔ میں وہ نقد لے کر بازار میں گیا، اسباب سوداگری کا خرید کر ایک بڑے سوداگر کے سپرد کیا۔
5۔ وہاں سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہوا، اور خدا کے توکل پر بھروسہ کر کے دو منزل کی ایک منزل کرتا ہوا دمشق کے پاس جا پہنچا۔

1.7 مشقی سوالات

1۔ داستان کی تعریف کرتے ہوئے باغ و بہار کا تعارف پیش کیجیے۔
2۔ 'سیر پہلے درویش کی' کا خلاصہ بیان کیجئے۔
3۔ پڑھنے کی مہارت کے حوالے سے 'باغ و بہار' کے متن کی اہمیت واضح کیجیے۔
4۔ اسم اور ضمیر کی تعریف مع مثال کے بیان کیجئے نیز منتخبہ متن میں اس کے استعمال کی نشاندہی کیجئے۔
5۔ 'سیر پہلے درویش کی' کا فنی تجزیہ کیجئے۔

1.8 مزید مطالعے کے لئے کتب

1۔ میر امن، باغ و بہار، اعجاز پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۹
2۔ اطہر پرویز، داستان کا فن، اردو گھر، علی گڑھ، ۲۰۱۰

3۔ابن کنول، داستان سے ناول تک، ایس این لینگویج اکیڈمی، نئی دہلی، ۲۰۰۳
4۔میر امن، قصہ چار درویش (باغ و بہار)، ہند پاکٹ بکس، دلی
5۔ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، باغ و بہار میر امن دلی والے، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰۴

اکائی 2 : عیدگاہ، پریم چند

ساخت

2.0 مقاصد

2.1 تمہید (مصنف اور پوری اکائی کا تعارف)

2.2 موضوع کی وضاحت

2.2.1 متن، عیدگاہ

2.2.2 عیدگاہ کا فنی تجزیہ

خود اکتسابی کے لیے سوالات I

2.2.3 زبان کی مہارتیں (سننے کی مہارت کے حوالے سے)

2.2.4 قواعد (صفت)

خود اکتسابی کے لیے سوالات II

2.3 الفاظ اور معنی

2.4 خود اکتسابی سوالات کے جوابات I

خود اکتسابی سوالات کے جوابات II

2.5 خلاصہ

2.6 خود اکتسابی کے لئے مشق

تحریری سرگرمیاں: دیئے گئے جملوں میں اسم، صفت، فعل فاعل، مفعول، محاورے اور روزمرہ کی نشاندہی کریں۔

کام کا تجربہ: دیئے گئے اردو جملوں کا انگریزی اور انگریزی جملوں کا اردو میں لفظی ترجمہ کریں۔

2.7 مشقی سوالات

2.8 مزید مطالعے کے لئے کتب

2.0 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ۔۔۔۔۔

☆ افسانہ 'عیدگاہ' اور اس کے خالق پریم چند سے تعارف حاصل کرسکیں گے۔

☆ افسانہ 'عیدگاہ' کی فنی خصوصیات سے آگاہ ہوسکیں گے۔

☆ سننے کی مہارت کی اہمیت سے واقف ہوسکیں گے۔

☆ صفت کی اقسام اور باریکیوں سے واقف ہوسکیں گے۔

2.1 تمہید

پریم چند (۱۸۸۰۔۱۹۳۶) اردو اور ہندی کے مشہور افسانہ نگار، ناول نگار اور ادیب تھے۔ ان کا اصل نام دھنپت رائے تھا مگر ادبی دنیا میں انہوں نے پریم چند کے قلمی نام سے اپنی شناخت قائم کی۔ وہ بنارس میں پیدا ہوئے اور بنارس کی مٹی میں ہی دفن ہوئے۔ ابتدا میں انہوں نے نواب رائے کے نام سے قلمی زندگی کا آغاز کیا لیکن بعد میں وہ پریم چند کے نام سے ہی مشہور ہوئے۔ ان کا بچپن غریبی اور کسم پرسی میں گزرا۔ آٹھ برس کی عمر میں انہوں نے فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انگریزی کی تعلیم حاصل کی اور ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد انہوں نے پرائیویٹ طور پر بی۔ اے کی ڈگری بھی حاصل کی لیکن مالی استطاعت نہ ہونے کے باعث وہ مزید اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ ۱۹۰۸ میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'سوز وطن' منظر عام پر آیا جس میں حب الوطنی کے جذبے سے معمور افسانے شامل تھے لہذا انگریزی حکومت نے اس کتاب پر پابندی لگا دی۔ ان کے اہم افسانوں میں کفن، عیدگاہ، پوس کی رات، دو بیل، بڑے گھر کی بیٹی، بوڑھی کاکی اور دنیا کا سب سے انمول رتن کے علاوہ دیگر کئی نام شامل ہیں۔ سوز وطن کے علاوہ ان کے دیگر افسانوی مجموعوں میں پریم پچیسی، پریم چالیسی، زادراہ اور واردات کے نام شامل ہیں۔ انہوں نے اردو ادب کو کئی بہترین ناول بھی دیئے جن میں 'گئودان' کا نام سرفہرست ہے۔ اس کے علاوہ بازار حسن، گوشہ عافیت، میدان عمل، چوگان ہستی اور نرملا ان کے اہم ناول ہیں۔

پریم چند کو اردو ادب کے صف اول کے افسانہ نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ انہوں نے فن افسانہ نگاری کو نہ صرف عروج بخشا بلکہ اسے زندگی سے قریب تر بھی کیا۔ انہوں نے اپنے افسانوں کی بنیاد حقیقت نگاری پر رکھی۔ چونکہ وہ خود گاؤں سے تعلق رکھتے تھے لہذا انہوں نے ہندوستان کے دیہاتوں، قصبوں اور چھوٹے شہروں کی کہانیاں لکھیں۔ انہوں نے کسان، مزدور اور غریب و متوسط طبقے کے دیگر افراد کی مشکل اور غمزدہ زندگی کے کرب کو محسوس کیا اور اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر نہایت سچائی کے ساتھ اسے اپنے افسانوں اور ناولوں میں پیش کر دیا۔ ان کی کہانیوں میں ہندوستان کی دیہی زندگی کی حقیقی لیکن تلخ تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں۔

نصاب میں شامل افسانہ 'عیدگاہ' بھی ایک غریب اور یتیم بچے کی کہانی ہے جو اپنی دادی کے ساتھ نہایت کسم پرسی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ حامد ایک دس گیارہ سالہ بچہ ہے جس کی کل کائنات اس کی دادی امینہ ہے۔ عید کے دن دادی امینہ اسے تین پیسے دے کر عیدگاہ روانہ کرتی ہے تاکہ حامد عید کے میلے سے کھلونے خرید سکے لیکن حامد کھلونوں کے بجائے اپنی دادی کے لئے لوہے کا ایک چمٹا خریدتا ہے تاکہ روٹی بناتے ہوئے اس کی دادی کے ہاتھ نہ جلیں۔ ایثار و قربانی کی یہ کہانی قارئین کے ذہن و دل کو جھنجھوڑ دیتی ہے۔ ایک معصوم بچے کی جذباتی کشمکش اور احساس ذمہ داری کی یہ کہانی اردو ادب کے شاہکار افسانوں میں شمار ہوتی ہے۔

2.2 موضوع کی وضاحت

2.2.1 افسانہ 'عیدگاہ' (ماخوذ از پریم چند کے منتخب افسانے، مرتبہ شمیم حنفی)

(۱)

رمضان کے پورے تیس روزوں کے بعد آج عید آئی۔ کتنی سہانی اور رنگین صبح ہے۔ بچے کی طرح پر تبسم، درختوں پر کچھ عجیب ہریاول ہے۔ کھیتوں میں کچھ عجیب رونق ہے۔ آسمان پر کچھ عجیب فضا ہے۔ آج کا آفتاب دیکھ کتنا پیارا ہے گویا دنیا کو عید کی خوشی پر مبارکباد دے رہا ہے۔ گاؤں میں کتنی چہل پہل ہے۔ عیدگاہ جانے کی دھوم ہے۔ کسی کے کرتے میں بٹن نہیں ہیں تو سوئی تاگا لینے دوڑے

جارہا ہے۔کسی کے جوتے سخت ہو گئے ہیں۔اسے تیل اور پانی سے نرم کررہا ہے۔جلدی جلدی بیلوں کو سانی پانی دے دیں۔عیدگاہ سے لوٹتے لوٹتے دوپہر ہو جائے گی۔

تین کوس کا پیدل راستہ پھر سینکڑوں رشتے قرابت والوں سے ملنا ملانا۔دوپہر سے پہلے لوٹنا غیر ممکن ہے۔لڑکے سب سے زیادہ خوش ہیں۔کسی نے ایک روزہ رکھا، وہ بھی دوپہر تک۔کسی نے وہ بھی نہیں لیکن عیدگاہ جانے کی خوشی ان کا حصہ ہے۔روزے بڑے بوڑھوں کے لئے ہوں گے، بچوں کے لئے تو عید ہے۔روز عید کا نام رٹتے تھے آج وہ آ گئی۔اب جلدی پڑی ہوئی ہے کہ عیدگاہ کیوں نہیں چلتے۔انہیں گھر کی فکروں سے کیا واسطہ؟ سویّوں کے لئے گھر میں دودھ اور شکر میوے ہیں یا نہیں، اس کی انہیں کیا فکر؟ وہ کیا جانیں ابا کیوں بدحواس گاؤں کے مہاجن چودھری قاسم علی کے گھر دوڑے جارہے ہیں۔

ان کی اپنی جیبوں میں تو قارون کا خزانہ رکھا ہوا ہے۔بار بار جیب سے خزانہ نکال کر گنتے ہیں۔دوستوں کو دکھاتے ہیں اور خوش ہو کر رکھ لیتے ہیں۔ان ہی دو چار پیسوں میں دنیا کی سات نعمتیں لائیں گے۔کھلونے اور مٹھائیاں اور بگل اور خدا جانے کیا کیا۔سب سے زیادہ خوش ہے حامد۔وہ چار سال کا غریب خوب صورت بچہ ہے جس کا باپ پچھلے سال ہیضہ کی نذر ہو گیا تھا اور ماں نہ جانے کیوں زرد ہوتی ہوتی ایک دن مر گئی۔کسی کو پتہ نہ چلا کہ بیماری کیا ہے؟ کہتی کس سے؟ کون سننے والا تھا؟ دل پر جو گزرتی تھی سہتی تھی اور جب نہ سہا گیا تو دنیا سے رخصت ہو گئی۔اب حامد اپنی بوڑھی دادی امینہ کی گود میں سوتا ہے اور اتنا ہی خوش ہے۔اس کے ابا جان بڑی دور روپے کمانے گئے تھے اور بہت سی تھیلیاں لے کر آئیں گے۔امی جان اللہ میاں کے گھر مٹھائی لینے گئی ہیں۔اس لئے خاموش ہے۔حامد کے پاؤں میں جوتے نہیں ہیں۔سر پر ایک پرانی دھرانی ٹوپی ہے جس کا گوٹہ سیاہ ہو گیا ہے پھر بھی وہ خوش ہے۔جب اس کے ابّا جان تھیلیاں اور اماں جان نعمتیں لے کر آئیں گے تب وہ دل کے ارمان نکالے گا۔تب دیکھے گا کہ محمود اور محسن آذر اور سمیع کہاں سے اتنے پیسے لاتے ہیں۔دنیا اپنی مصیبتوں کی ساری فوج لے کر آئے، اس کی ایک نگاہِ معصوم اسے پامال کرنے کے لئے کافی ہے۔

حامد اندر جا کر امینہ سے کہتا ہے، تم ڈرنا نہیں امّاں! میں گاؤں والوں کا ساتھ نہ چھوڑوں گا۔بالکل نہ ڈرنا لیکن امینہ کا دل نہیں مانتا۔گاؤں کے بچے اپنے اپنے باپ کے ساتھ جارہے ہیں۔حامد کیا اکیلا ہی جائے گا۔اس بھیڑ بھاڑ میں کہیں کھو جائے تو کیا ہو؟ نہیں امینہ اسے تنہا نہ جانے دے گی۔ننھی سی جان۔تین کوس چلے گا تو پاؤں میں چھالے نہ پڑ جائیں گے؟

مگر وہ چلی جائے تو یہاں سوّیاں کون پکائے گا، بھوکا پیاسا دوپہر کو لوٹے گا، کیا اس وقت سوّیاں پکانے بیٹھے گی۔رونا تو یہ ہے کہ امینہ کے پاس پیسے نہیں ہیں۔اس نے فہیمن کے کپڑے سیے تھے۔آٹھ آنے پیسے ملے تھے۔اس اٹھنی کو ایمان کی طرح بچاتی چلی آئی تھی اس عید کے لئے لیکن گھر میں پیسے اور نہ تھے اور گوالن کے پیسے اور چڑھ گئے تھے، دینے پڑے۔حامد کے لئے روز دو پیسے کا دودھ تو لینا پڑتا ہے اب کل دو آنے پیسے بچ رہے ہیں۔تین پیسے حامد کی جیب میں اور پانچ امینہ کے بٹوے میں۔یہی بساط ہے۔اللہ ہی بیڑا پار کرے گا۔دھوبن مہترانی اور نائن بھی تو آئیں گی۔سب کو سیویّاں چاہئیں۔کس کس سے منہ چھپائے؟ سال بھر کا تہوار ہے۔زندگی خیریت سے رہے۔ان کی تقدیر بھی تو اس کے ساتھ ہے بچّے کو خدا سلامت رکھے یہ دن بھی یوں ہی کٹ جائیں گے۔

گاؤں سے لوگ چلے اور حامد بھی بچّوں کے ساتھ تھا۔سب کے سب دوڑ کر نکل جاتے۔پھر کسی درخت کے نیچے کھڑے ہو کر ساتھ والوں کا انتظار کرتے۔یہ لوگ کیوں اتنے آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔

شہر کا سرا شروع ہو گیا۔سڑک کے دونوں طرف امیروں کے باغ ہیں پختہ چہار دیواری بنی ہوئی ہے۔درختوں میں آم لگے ہوئے ہیں۔حامد نے ایک کنکری اٹھا کر ایک آم پر نشانہ لگایا۔مالی اندر سے گالی دیتا ہوا باہر آیا۔بچّے وہاں سے ایک فرلانگ پر ہیں۔خوب ہنس رہے ہیں۔مالی کو خوب الّو بنایا۔

بڑی بڑی عمارتیں آنے لگیں۔یہ عدالت ہے۔یہ مدرسہ ہے۔یہ کلب گھر ہے۔اتنے بڑے مدرسے میں کتنے سارے لڑکے پڑھتے ہوں گے۔لڑکے نہیں ہیں جی بڑے بڑے آدمی ہیں۔سچ ان کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں۔اتنے بڑے ہو گئے اب تک پڑھنے جاتے

ہیں۔آج تو چھٹی ہے لیکن ایک بار جب پہلے آئے تھے۔تو بہت سے داڑھی مونچھوں والے لڑکے یہاں کھیل رہے تھے۔نہ جانے کب تک پڑھیں گے۔اور کیا کریں گے اتنا پڑھ کر۔گاؤں کے دیہاتی مدرسے میں دو تین بڑے بڑے لڑکے ہیں۔بالکل کودن غبی۔کام سے جی چرانے والے۔یہ لڑکے بھی اسی طرح کے ہوں گے جی۔اور کیا نہیں۔کیا اب تک پڑھتے ہوتے۔وہ کلب گھر ہے۔وہاں جادو کا کھیل ہوتا ہے۔سنا ہے مردوں کی کھوپڑیاں اڑتی ہیں۔آدمی بے ہوش کر دیتے ہیں۔پھر اس سے جو کچھ پوچھتے ہیں وہ سب بتلا دیتے ہیں اور بڑے بڑے تماشے ہوتے ہیں اور میمیں بھی کھیلتی ہیں۔سچ، ہماری اماں کو وہ دے دو۔کیا کہلاتا ہے۔''بیٹ'' تو اسے گھماتے ہی لڑھک جائیں۔

محسن نے کہا،''ہماری امّی جان تو اسے پکڑ ہی نہ سکیں۔ہاتھ کانپنے لگیں۔اللہ قسم'' حامد نے اس سے اختلاف کیا، چلومنوں آٹا پیس ڈالتی ہیں۔ذرا سی بیٹ پکڑ لیں گے تو ہاتھ کانپنے لگے گا۔سینکڑوں گھڑے پانی روز نکالتی ہیں۔کسی میم کو ایک گھڑا پانی نکالنا پڑے تو آنکھوں تلے اندھیرا آجائے۔''

محسن،''لیکن دوڑتی تو نہیں۔اچھل کود نہیں سکتیں۔''

حامد،''کام آپڑتا ہے تو دوڑ بھی لیتی ہیں ابھی اس دن تمھاری گائے کھل گئی تھی اور چودھری کے کھیت میں جا پڑی تھی تو تمھاری امّاں ہی تو دوڑ کر اسے بھگا لائی تھیں۔کتنی تیزی سے دوڑی تھیں۔ہم تم دونوں ان سے پیچھے رہ گئے۔''

پھر آگے چلے۔حلوائیوں کی دکانیں شروع ہوگئیں۔آج خوب سجی ہوئی تھیں۔''اتنی مٹھائیاں کون کھاتا ہے؟ دیکھو نا ایک ایک دکان پر منوں ہوں گی۔سنا ہے رات کو ایک جنّات ہر ایک دکان پر جاتا ہے۔جتنا مال بچا ہوتا ہے وہ سب خرید لیتا ہے اور سچ مچ کے روپے دیتا ہے بالکل ایسے ہی چاندی کے روپے۔''

محمود کو یقین نہ آیا،''ایسے روپے جنّات کو کہاں سے مل جائیں گے''

محسن،''جنّات کو روپوں کی کیا کمی؟ جس خزانہ میں چاہیں چلے جائیں کوئی انھیں دیکھ نہیں سکتا۔لوہے کے دروازے تک نہیں روک سکتے۔جناب آپ ہیں کس خیال میں۔ہیرے جواہرات ان کے پاس رہتے ہیں۔جس سے خوش ہوگئے اسے ٹوکروں جواہرات دے دیے۔پانچ منٹ میں کہو کابل پہنچ جائیں۔''

حامد،''جنات بہت بڑے ہوتے ہوں گے۔''

محسن،''اور کیا ایک ایک آسمان کے برابر ہوتا ہے۔زمین پر کھڑا ہو جائے تو اس کا سر آسمان سے جا لگے۔مگر چاہے تو ایک لوٹے میں گھس جائے۔''

سمیع،''سنا ہے چودھری صاحب کے قبضہ میں بہت سے جنات ہیں۔کوئی چیز چوری چلی جائے، چودھری صاحب اس کا پتہ بتا دیں گے اور چور کا نام تک بتا دیں گے۔جمعراتی کا بچھڑا اس دن کھو گیا تھا۔تین دن حیران ہوئے، کہیں نہ ملا، تب جھک مار کر چودھری کے پاس گئے۔چودھری نے کہا، مویشی خانہ میں ہے اور وہیں ملا۔جنات آکر انہیں سب خبریں دے جایا کرتے ہیں۔''

اب ہر ایک کی سمجھ میں آگیا کہ چودھری قاسم علی کے پاس کیوں اس قدر دولت ہے اور کیوں وہ قرب و جوار کے مواضعات کے مہاجن ہیں۔جنات آکر انہیں روپے دے جاتے ہیں۔آگے چلئے یہ پولیس لائن ہے۔یہاں پولیس والے قواعد کرتے ہیں۔رائٹ لپ، پھام پھو۔

نوری نے تصحیح کی،''یہاں پولیس والے پہرہ دیتے ہیں۔جب ہی تو انہیں بہت خبر ہے۔اجی حضرت یہ لوگ چوریاں کراتے ہیں۔شہر کے جتنے چور ڈاکو ہیں سب ان سے ملے رہتے ہیں۔رات کو سب ایک محلّہ میں چوروں سے کہتے ہیں اور دوسرے محلّہ میں پکارتے ہیں جاگتے رہو۔میرے ماموں صاحب ایک تھانہ میں سپاہی ہیں۔بیس روپے مہینہ پاتے ہیں لیکن تھیلیاں بھر بھر گھر بھیجتے ہیں۔میں نے ایک بار پوچھا تھا، ماموں اتنے روپے آپ چاہیں تو ایک دن میں لاکھوں بار لائیں۔ہم تو اتنا ہی لیتے ہیں جس میں اپنی بدنامی نہ

ہواورنوکری بنی رہے۔''

حامد نے تعجب سے پوچھا،''یہ لوگ چوری کراتے ہیں تو انہیں کوئی پکڑتا نہیں؟'' نوری نے اس کی کوتاہ فہمی پر رحم کھا کر کہا، ''ارے احمق! انہیں کون پکڑے گا، پکڑنے والے تو یہ خود ہیں لیکن اللہ انہیں سزا بھی خوب دیتا ہے۔تھوڑے دن ہوئے ماموں کے گھر میں آگ لگ گئی۔سارا مال متاع جل گیا۔ایک برتن تک نہ بچا۔کئی دن تک درخت کے سائے کے نیچے سوئے، اللہ قسم پھر نہ جانے کہاں سے قرض لائے تو برتن بھانڈے آئے۔''

بستی گھنی ہونے لگی۔عیدگاہ جانے والوں کے مجمعے نظر آنے لگے۔ایک سے ایک زرق برق پوشاک پہنے ہوئے۔کوئی تانگے پرسوار کوئی موٹر پر چلتے تھے تو کپڑوں سے عطر کی خوشبو اڑتی تھی۔

دہقانوں کی یہ مختصر سی ٹولی اپنی بے سروسامانی سے بے حس اپنی خستہ حالی میں مگر صابر وشاکر چلی جاتی تھی۔جس چیز کی طرف تاکتے، تاکتے رہ جاتے اور پیچھے سے بار بار ہارن کی آواز ہونے پر بھی خبر نہ ہوتی تھی۔محسن تو موٹر کے نیچے جاتے جاتے بچا۔

وہ عیدگاہ نظر آئی۔جماعت شروع ہوگئی ہے۔املی کے گھنے درختوں کا سایہ ہے نیچے کھلا ہوا پختہ فرش ہے۔جس پر جازم بچھا ہوا ہے اور نمازیوں کی قطاریں ایک کے پیچھے دوسرے خدا جانے کہاں تک چلی گئی ہیں۔پختہ فرش کے نیچے جازم بھی نہیں۔کئی قطاریں کھڑی ہیں جو آتے جاتے ہیں پیچھے کھڑے ہوتے جاتے ہیں۔آگے اب جگہ نہیں رہی۔یہاں کوئی رتبہ اور عہدہ نہیں دیکھتا۔اسلام کی نگاہ میں سب برابر ہیں۔دہقانوں نے بھی وضو کیا اور جماعت میں شامل ہو گئے۔کتنی باقاعدہ منظّم جماعت ہے، لاکھوں آدمی ایک ساتھ جھکتے ہیں، ایک ساتھ دوزانو بیٹھ جاتے ہیں اور یہ عمل بار بار ہوتا ہے ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا بجلی کی لاکھوں بتیاں ایک ساتھ روشن ہو جائیں اور ایک ساتھ بجھ جائیں۔کتنا پراحترام رعب انگیز نظارہ ہے۔جس کی ہم آہنگی اور وسعت اور تعداد دلوں پر ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔گویا اخوت کا رشتہ ان تمام روحوں کو منسلک کئے ہوئے ہے۔

(۲)

نماز ختم ہوگئی ہے لوگ باہم گلے مل رہے ہیں۔کچھ لوگ محتاجوں اور سائلوں کو خیرات کر رہے ہیں۔جو آج یہاں ہزاروں جمع ہو گئے ہیں۔ہمارے دہقانوں نے مٹھائی اور کھلونوں کی دُکانوں پر یورش کی۔بوڑھے بھی ان دلچسپیوں میں بچوں سے کم محظوظ نہیں ہیں۔یہ دیکھو ہنڈولا ہے۔ایک پیسہ دے کر آسمان پر جاتے معلوم ہوں گے۔کبھی زمین پر گرتے ہیں۔یہ چرخی ہے۔لکڑی کے گھوڑے، اونٹ، ہاتھی منجوں سے لٹکے ہوئے ہیں۔ایک پیسہ دے کر بیٹھ جاؤ اور پچیس چکروں کا مزہ لو۔محمود اور محسن دونوں ہنڈولے پر بیٹھے ہیں۔آذر اور سمیع گھوڑوں پر۔ان کے بزرگ اتنے ہی طفلانہ اشتیاق سے چرخی پر بیٹھے ہیں۔حامد دور کھڑا ہے تین ہی پیسے تو اس کے پاس ہیں۔ذرا سا چکر کھانے کے لئے وہ اپنے خزانہ کا ثلث نہیں صَرف کر سکتا۔محسن کا باپ بار بار اسے چرخی پر بلاتا ہے لیکن وہ راضی نہیں ہوتا۔بوڑھے کہتے ہیں اس لڑکے میں ابھی سے اپنا پرایا آ گیا ہے۔حامد سوچتا ہے، کیوں کسی کا احسان لوں؟ عسرت نے اسے ضرورت سے زیادہ ذکی الحس بنا دیا ہے۔

سب لوگ چرخی سے اترتے ہیں۔کھلونوں کی خرید شروع ہوتی ہے۔سپاہی اور گجریا اور راجہ رانی اور وکیل اور دھوبی اور بہشتی بے امتیاز ران سے ران ملائے بیٹھے ہیں۔دھوبی راجہ رانی کی بغل میں ہے اور بہشتی وکیل صاحب کی بغل میں۔واہ کتنے خوبصورت، بولا ہی چاہتے ہیں۔محمود سپاہی پر لٹو ہو جاتا ہے۔خاکی وردی اور پگڑی لال، کندھے پر بندوق، معلوم ہوتا ہے ابھی قواعد کے لئے چلا آ رہا ہے۔محسن کو بہشتی پسند آیا۔کمر جھکی ہوئی ہے اس پر مشک کا دہانہ ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے ہے۔دوسرے ہاتھ میں رسی ہے، کتنا بشاش چہرہ ہے، شاید کوئی گیت گا رہا ہے۔مشک سے پانی ٹپکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔نوری کو وکیل سے مناسبت ہے۔کتنی عالمانہ صورت ہے، سیاہ چغہ نیچے سفید اچکن، اچکن کے سینہ کی جیب میں سنہری زنجیر، ایک ہاتھ میں قانون کی کتاب لئے ہوئے ہے۔معلوم ہوتا ہے، ابھی کسی عدالت سے جرح یا بحث کر کے چلے آ رہے ہیں۔یہ سب دو دو پیسے کے کھلونے ہیں۔حامد کے پاس کل تین پیسے ہیں۔اگر دو کا ایک کھلونا لے لے

تو پھر اور کیا لے گا؟ نہیں کھلونے فضول ہیں۔ کہیں ہاتھ سے گر پڑے تو چور چور ہو جائے۔ ذرا سا پانی پڑ جائے تو سارا رنگ دھل جائے۔ ان کھلونوں کو لے کر وہ کیا کرے گا، کس مصرف کے ہیں؟

محسن کہتا ہے، ''میرا بہشتی روز پانی دے جائے گا صبح شام۔''

نوری بولی، ''اور میرا وکیل روز مقدمے لڑے گا اور روز روپے لائے گا''

حامد کھلونوں کی مذمت کرتا ہے۔ مٹی کے ہی تو ہیں، گریں تو چکنا چور ہو جائیں، لیکن ہر چیز کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے اور چاہتا ہے کہ ذرا دیر کے لئے انہیں ہاتھ میں لے سکتا۔ یہ بساطی کی دکان ہے، طرح طرح کی ضروری چیزیں، ایک چادر بچھی ہوئی ہے۔ گیند، سیٹیاں، بگل، بھنورے، ربڑ کے کھلونے اور ہزاروں چیزیں۔ محسن ایک سیٹی لیتا ہے محمود گیند، نوری ربڑ کا بت جو چوں چوں کرتا ہے اور سمیع ایک بانسری۔ اسے وہ بجا بجا کر گائے گا۔ حامد کھڑا ہر ایک کو حسرت سے دیکھ رہا ہے۔ جب اس کا رفیق کوئی چیز خرید لیتا ہے تو وہ بڑے اشتیاق سے ایک بار اسے ہاتھ میں لے کر دیکھنے کے لئے لپکتا ہے۔ لیکن لڑکے اتنے دوست نواز نہیں ہوتے۔ خاص کر جب کہ ابھی دلچسپی تازہ ہے۔ بے چارہ یوں ہی مایوس ہو کر رہ جاتا ہے۔

کھلونوں کے بعد مٹھائیوں کا نمبر آیا۔ کسی نے ریوڑیاں لی ہیں، کسی نے گلاب جامن، کسی نے سوہن حلوہ۔ مزے سے کھا رہے ہیں۔ حامد ان کی برادری سے خارج ہے۔ کمبخت کی جیب میں تین پیسے تو ہیں، کیوں نہیں کچھ لے کر کھاتا۔ حریص نگاہوں سے سب کی طرف دیکھتا ہے۔

محسن نے کہا، ''حامد یہ ریوڑی لے جا کتنی خوشبودار ہیں۔''

حامد سمجھ گیا یہ محض شرارت ہے۔ محسن اتنا فیاض طبع نہ تھا۔ پھر بھی وہ اس کے پاس گیا۔ محسن نے دو تین سے دو تین ریوڑیاں نکالیں۔ حامد کی طرف بڑھائیں۔ حامد نے ہاتھ پھیلایا۔ محسن نے ہاتھ کھینچ لیا اور ریوڑیاں اپنے منھ میں رکھ لیں۔ محمود اور نوری اور سمیع خوب تالیاں بجا بجا کر ہنسنے لگے۔ حامد کھسیانہ ہو گیا۔ محسن نے کہا، ''اچھا اب ضرور دیں گے۔ یہ لے جاؤ۔ اللہ قسم۔''

حامد نے کہا، ''رکھیے رکھیے کیا میرے پاس پیسے نہیں ہیں؟''

سمیع بولا، ''تین ہی پیسے تو ہیں، کیا کیا لو گے؟''

محمود بولا، ''تم اس سے مت بولو، حامد میرے پاس آؤ۔ یہ گلاب جامن لے لو''

حامد، ''مٹھائی کون سی بڑی نعمت ہے۔ کتاب میں اس کی برائیاں لکھی ہیں۔''

محسن، ''لیکن جی میں کہہ رہے ہو گے کہ کچھ مل جائے تو کھا لیں۔ اپنے پیسے کیوں نہیں نکالتے؟''

محمود، ''اس کی ہوشیاری میں سمجھتا ہوں۔ جب ہمارے سارے پیسے خرچ ہو جائیں گے، تب یہ مٹھائی لے گا اور ہمیں چڑا چڑا کر کھائے گا۔''

حلوائیوں کی دکانوں کے آگے کچھ دکانیں لوہے کی چیزوں کی تھیں۔ کچھ گلٹ اور ملمع کے زیورات کی۔ لڑکوں کے لئے یہاں دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ حامد لوہے کی دُکان پر ایک لمحہ کے لئے رک گیا۔ دست پناہ رکھے ہوئے تھے۔ وہ دست پناہ خرید لے گا۔ ماں کے پاس دست پناہ نہیں ہے۔ توے سے روٹیاں اتارتی ہیں تو ہاتھ جل جاتا ہے۔ اگر وہ دست پناہ لے جا کر اماں کو دے دے تو وہ کتنی خوش ہوں گی۔ پھر ان کی انگلیاں کبھی نہیں جلیں گی۔ گھر میں ایک کام کی چیز ہو جائے گی۔ کھلونوں سے کیا فائدہ۔ مفت میں پیسے خراب ہوتے ہیں۔ ذرا دیر ہی تو خوشی ہوتی ہے پھر تو انہیں کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ یا تو گھر پہنچتے پہنچتے ٹوٹ پھوٹ کر برباد ہو جائیں گے یا چھوٹے بچے جو عیدگاہ نہیں جا سکتے ہیں ضد کر کے لے لیں گے اور توڑ ڈالیں گے۔

دست پناہ کتنے فائدہ کی چیز ہے۔ روٹیاں توے سے اتار لو، چولھے سے آگ نکال کر دے دو۔ اماں کو فرصت کہاں ہے بازار آئیں اور اتنے پیسے کہاں ملتے ہیں۔ روز ہاتھ جلا لیتی ہیں۔ اس کے ساتھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ سبیل پر سب کے سب پانی پی رہے ہیں۔

کتنے لالچی ہیں۔سب نے اتنی مٹھائیاں لیں کسی نے مجھے ایک بھی نہ دی۔اس پر کہتے ہیں میرے ساتھ کھیلو۔میری تختی دھولاؤ۔اب اگر یہاں محسن نے کوئی کام کرنے کو کہا تو خبر لوں گا۔کھائیں مٹھائیاں، آپ ہی منہ سڑے گا، پھوڑے پھنسیاں نکلیں گی۔آپ ہی زبان چٹوری ہو جائے گی۔تب پیسے چرائیں گے اور مار کھائیں گے۔

میری زبان کیوں خراب ہوگی۔اس نے پھر سوچا، اماں دست پناہ دیکھتے ہی دوڑ کر میرے ہاتھ سے لے لیں گی اور کہیں گی۔ میرا بیٹا اپنی ماں کے لئے دست پناہ لایا ہے، ہزاروں دُعائیں دیں گی۔پھر اسے پڑوسیوں کو دکھائیں گی۔سارے گاؤں میں واہ واہ مچ جائے گی۔ان لوگوں کے کھلونوں پر کون انہیں دعائیں دے گا۔بزرگوں کی دعائیں سیدھی خدا کی درگاہ میں پہنچتی ہیں اور فوراً قبول ہوتی ہیں۔میرے پاس بہت سے پیسے نہیں ہیں۔جب ہی تو محسن اور محمود یوں مزاج دکھاتے ہیں۔میں بھی ان کو مزاج دکھاؤں گا۔وہ کھلونے کھیلیں، مٹھائیاں کھائیں میں غریب سہی۔کسی سے کچھ مانگنے تو نہیں جاتا۔آخر ابا کبھی نہ کبھی آئیں گے ہی پھر ان لوگوں سے پوچھوں گا کتنے کھلونے لوگے؟ ایک ایک کو ایک ٹوکری دوں اور دکھادوں کہ دوستوں کے ساتھ اس طرح سلوک کیا جاتا ہے۔جتنے غریب لڑکے ہیں سب کو اچھے اچھے کرتے دلوادوں گا اور کتابیں دے دوں گا۔یہ نہیں کہ ایک پیسہ کی ریوڑیاں لیں تو چڑا چڑا کر کھانے لگیں۔دست پناہ دیکھ کر سب کے سب ہنسیں گے۔احمق تو ہیں ہی سب۔اس نے ڈرتے ڈرتے دُکاندار سے پوچھا، ''یہ دست پناہ بیچو گے؟'' دکاندار نے اس کی طرف دیکھا اور ساتھ کوئی آدمی نہ دیکھ کر کہا، ''وہ تمہارے کام کا نہیں ہے۔''

''بکاؤ ہے یا نہیں؟''

''بکاؤ ہے جی اور یہاں کیوں لاد کر لائے ہیں''

''تو بتلاتے کیوں نہیں؟ کے پیسے کا دو گے؟''

''چھ پیسے لگے لگا''

حامد کا دل بیٹھ گیا۔کلیجہ مضبوط کر کے بولا، تین پیسے لو گے؟ اور آگے بڑھا کہ دکاندار کی گھرکیاں نہ سنے، مگر دکاندار نے گھرکیاں نہ دیں۔دست پناہ اس کی طرف بڑھا دیا اور پیسے لے لئے۔حامد نے دست پناہ کندھے پر رکھ لیا، گویا بندوق ہے اور شان سے اکڑتا ہوا اپنے رفیقوں کے پاس آیا۔محسن نے ہنستے ہوئے کہا، ''یہ دست پناہ لایا ہے۔احمق اسے کیا کرو گے؟''

حامد نے دست پناہ کو زمین پر پٹک کر کہا، ''ذرا اپنا بہشتی زمین پر گرادو، ساری پسلیاں چور چور ہو جائیں گی بچو کی''

محمود، ''تو یہ دست پناہ کوئی کھلونا ہے؟''

حامد، ''کھلونا کیوں نہیں ہے؟ ابھی کندھے پر رکھا، بندوق ہو گیا ہاتھ میں لے لیا فقیر کا چمٹا ہو گیا۔چاہوں تو اس سے تمہاری ناک پکڑ لوں۔ایک چمٹا دوں تو تم لوگوں کے سارے کھلونوں کی جان نکل جائے۔تمہارے کھلونے کتنا ہی زور لگائیں، اس کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔میرا بہادر شیر ہے یہ دست پناہ۔''

سمیع متاثر ہو کر بولا، ''میری خنجری سے بدلو گے؟ دو آنے کی ہے''

حامد نے خنجری کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہا، ''میرا دست پناہ چاہے تو تمہاری خنجری کا پیٹ پھاڑ ڈالے۔بس ایک چمڑے کی جھلی لگا دی، ڈھب ڈھب بولنے لگی۔ذرا سا پانی لگے تو ختم ہو جائے۔میرا بہادر دست پناہ تو آگ میں، پانی میں، آندھی میں، طوفان میں برابر ڈٹا رہے گا۔''

میلہ بہت دور پیچھے چھوٹ چکا تھا۔دس بج رہے تھے۔گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔اب دست پناہ نہیں مل سکتا تھا۔اب کسی کے پاس پیسے بھی تو نہیں رہے، حامد ہے بڑا ہوشیار۔

اب دو فریق ہو گئے، محمود، محسن اور نوری ایک طرف۔حامد یکہ و تنہا دوسری طرف۔سمیع غیر جانبدار ہے جس کی فتح دیکھے گا اس کی طرف ہو جائے گا۔مناظرہ شروع ہو گیا۔آج حامد کی زبان بڑی صفائی سے چل رہی ہے۔اتحادِ ثلاثہ اس کے جارحانہ عمل سے پریشان ہو

رہا ہے۔ ثلاثہ کے پاس تعداد کی طاقت ہے، حامد کے پاس حق اور اخلاق، ایک طرف مٹی ربڑ اور لکڑی کی چیزیں دوسری جانب اکیلا لوہا۔ جو اس وقت اپنے آپ کو فولاد کہہ رہا ہے۔ وہ روئیں تن ہے۔ صف شکن ہے۔ اگر کہیں شیر کی آواز کان میں آجائے تو میاں بہشتی کے اوسان خطا ہو جائیں۔ میاں سپاہی مٹکی بندوق چھوڑ کر بھاگیں۔ وکیل صاحب کا سارا قانون پیٹ میں سما جائے۔ چغے میں منہ چھپا کر لیٹ جائیں۔ مگر بہادر یہ رستمِ ہند لپک کر شیر کی گردن پر سوار ہو جائے گا اور اس کی آنکھیں نکال لے گا۔

محسن نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کہا، ''اچھا تمہارا دست پناہ پانی تو نہیں بھر سکتا۔'' حامد نے دست پناہ کو سیدھا کر کے کہا، ''کہ یہ بہشتی کو ایک ڈانٹ پلائے گا تو دوڑا ہوا پانی لا کر اس کے دروازے پر چھڑکنے لگے گا۔ جناب اس سے چاہے گھڑے مٹکے اور کونڈے بھر لو۔''

محسن کا ناطقہ بند ہو گیا۔ نوری نے کمک پہنچائی، ''بچہ گرفتار ہو جائیں تو عدالت میں بندھے بندھے پھریں گے۔ تب تو ہمارے وکیل صاحب ہی پیروی کریں گے۔ بولئے جناب''

حامد کے پاس اس وار کا دفیعہ اتنا آسان نہ تھا، دفعتاً اس نے ذرا مہلت پا جانے کے ارادے سے پوچھا، ''اسے پکڑنے کون آئے گا؟''

محمود نے کہا، ''یہ سپاہی بندوق والا'' حامد نے منھ چڑا کر کہا ''یہ بے چارے اس رستم ہند کو پکڑ لیں گے؟ اچھا لاؤ ابھی ذرا مقابلہ ہو جائے۔ اس کی صورت دیکھتے ہی بچہ کی ماں مر جائے گی۔ طپکڑیں گے کیا بے چارے'' محسن نے تازہ دم ہو کر وار کیا، ''تمہارے دست پناہ کا منھ روز آگ میں جلا کرے گا۔'' حامد کے پاس جواب تیار تھا، ''آگ میں بہادر کودتے ہیں جناب۔ تمہارے یہ وکیل اور سپاہی اور بہشتی ڈرپوک ہیں۔ سب گھر میں گھس جائیں گے۔ آگ میں کودنا وہ کام ہے جو رستم ہی کر سکتا ہے۔''

نوری نے انتہائی جودت سے کام لیا، ''تمہارا دست پناہ باورچی خانہ میں زمین پر پڑا رہے گا۔ میرا وکیل شان سے میز کرسی لگا کر بیٹھے گا۔ اس جملہ نے مردوں میں بھی جان ڈال دی، سمیع بھی جیت گیا۔ بے شک بڑے معرکے کی بات کہی، دست پناہ باورچی خانہ میں پڑا رہے گا''

حامد نے دھاندلی کی، میرا دست پناہ باورچی خانہ میں رہے گا، وکیل صاحب کرسی پر بیٹھیں گے تو جا کر انہیں زمین پر پٹک دے گا اور سارا قانون ان کے پیٹ میں ڈال دے گا۔

اس جواب میں بالکل جان نہ تھی، بالکل بے تکی سی بات تھی لیکن قانون پیٹ میں ڈالنے والی بات چھا گئی۔ تینوں سورما منھ تکتے رہ گئے۔ حامد نے میدان جیت لیا، گو ثلاثہ کے پاس ابھی گیند سیٹی اور ربط ریز روتھے مگر ان مشین گنوں کے سامنے ان بزدلوں کو کون پوچھتا ہے۔ دست پناہ رستمِ ہند ہے۔ اس میں کسی کو چوں چرا کی گنجائش نہیں۔

فاتح کو مفتوحوں سے وقار اور خوشامد کا خراج ملتا ہے۔ وہ حامد کو ملنے لگا اور سب نے تین تین آنے خرچ کئے اور کوئی کام کی چیز نہ لا سکے۔ حامد نے تین ہی پیسوں میں رنگ جما لیا۔ کھلونوں کا کیا اعتبار۔ دو ایک دن میں ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔ حامد کا دست پناہ تو فاتح رہے گا۔ ہمیشہ صلح کی شرطیں طے ہونے لگیں۔

محسن نے کہا، ''ذرا اپنا چمٹا دو۔ ہم بھی تو دیکھیں۔ تم چاہو تو ہمارا وکیل دیکھ لو حامد!'' ہمیں اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ فیاض طبع فاتح ہے۔ دست پناہ باری باری سے محمود، محسن، نورا اور سمیع سب کے ہاتھوں میں گیا اور ان کے کھلونے باری باری حامد کے ہاتھ میں آئے۔ کتنے خوبصورت کھلونے ہیں، معلوم ہوتا ہے بولا ہی چاہتے ہیں۔ مگر ان کھلونوں کے لئے انہیں دعا کون دے گا؟ کون کون ان کھلونوں کو دیکھ کر اتنا خوش ہوگا جتنا اماں جان دست پناہ کو دیکھ کر ہوں گی۔ اسے اپنے طرزِ عمل پر مطلق پچھتاوا نہیں ہے۔ پھر اب دست پناہ تو ہے اور سب کا بادشاہ۔ راستے میں محمود نے ایک پیسے کی ککڑیاں لیں۔ اس میں حامد کو بھی خراج ملا حالانکہ وہ انکار کرتا رہا۔ محسن اور سمیع نے ایک ایک پیسے کے فالسے لئے، حامد کو خراج ملا۔ یہ سب رستم ہند کی برکت تھی۔

گیارہ بجے سارے گاؤں میں چہل پہل ہوگئی۔ میلے والے آ گئے۔ محسن کی چھوٹی بہن نے دوڑ کر بہشتی اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور مارے خوشی جو اچھلی تو میاں بہشتی نیچے آ رہے اور عالمِ جاودانی کو سدھارے۔ اس پر بھائی بہن میں مار پیٹ ہوئی۔ دونوں خوب روئے۔ ان کی اماں جان یہ کہرام سن کر اور بگڑیں۔ دونوں کو اوپر سے دو دو چانٹے رسید کئے۔ میاں نوری کے وکیل صاحب کا حشر اس سے بھی بدتر ہوا۔ وکیل زمین پر یا طاق پر تو نہیں بیٹھ سکتا۔ اس کی پوزیشن کا لحاظ تو کرنا ہی ہوگا۔ دیوار میں دو کھونٹیاں گاڑی گئیں۔ ان پر چیڑ کا ایک پرانا پٹڑا رکھا گیا۔ پٹرے پر سرخ رنگ کا ایک چیتھڑا بچھا دیا گیا جو بمنزلہ قالین کے تھا۔ وکیل صاحب عالم بالا پہ جلوہ افروز ہوئے۔ یہیں سے قانونی بحث کریں گے۔ نوری ایک پنکھا لے کر جھلنے لگی۔ معلوم نہیں پنکھے کی ہوا سے یا پنکھے کی چوٹ سے وکیل صاحب عالم بالا سے دنیائے فانی میں آ رہے۔ اور ان کی مجسم خاکی کے پرزے ہوئے۔ پھر بڑے زور کا ماتم ہوا اور وکیل صاحب کی میت پارسی دستور کے مطابق کوڑے پر پھینک دی گئی تا کہ بے کار نہ جا کر زاغ وزغن کے کام آ جائے۔

اب رہے میاں محمود کے سپاہی۔ وہ محترم اور ذی رعب ہستی ہے اپنے پیروں چلنے کی ذلت اسے گوارا نہیں۔ محمود نے اپنی بکری کا بچہ پکڑا اور اس پر سپاہی کو سوار کیا۔ محمود کی بہن ایک ہاتھ سے سپاہی کو پکڑے ہوئے تھی اور محمود بکری کے بچہ کا کان پکڑ کر اسے دروازے پر چلا رہا تھا اور اس کے دونوں بھائی سپاہی کی طرف سے تھونے والے داگتے لہو پکارتے چلتے تھے۔ معلوم نہیں کیا ہوا، میاں سپاہی اپنے گھوڑے کی پیٹھ سے گر پڑے اور اپنی بندوق لئے زمین پر آ رہے۔ ایک ٹانگ مضروب ہوگئی۔ مگر کوئی مضائقہ نہیں، محمود ہوشیار ڈاکٹر ہے۔ ڈاکٹر نگم اور بھاٹیہ اس کی شاگردی کر سکتے ہیں اور یہ ٹوٹی ٹانگ آناً فاناً میں جوڑ دے گا۔ صرف گولر کا دودھ چاہئے۔ گولر کا دودھ آتا ہے۔ ٹانگ جوڑی جاتی ہے لیکن جوں ہی کھڑا ہوتا ہے، ٹانگ پھر الگ ہو جاتی ہے۔ عملِ جراحی ناکام ہو جاتا ہے۔ تب محمود اس کی دوسری ٹانگ بھی توڑ دیتا ہے۔ اب وہ آرام سے ایک جگہ بیٹھ سکتا ہے۔ ایک ٹانگ سے تو نہ چل سکتا تھا نہ بیٹھ سکتا تھا۔ اب وہ گوشہ میں بیٹھ کر ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلے گا۔

اب میاں حامد کا قصہ سنئے۔ امینہ اس کی آواز سنتے ہی دوڑی اور اسے گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگی۔ دفعتاً اس کے ہاتھ میں چمٹا دیکھ کر چونک پڑی۔ ''یہ دست پناہ کہاں تھا بیٹا؟''

''میں نے مول لیا ہے، تین پیسے میں۔''

امینہ نے چھاتی پیٹ لی، ''یہ کیسا بے سمجھ لڑکا ہے کہ دوپہر ہوگئی۔ نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ لایا کیا یہ دست پناہ۔ سارے میلے میں تجھے اور کوئی چیز نہ ملی۔

حامد نے خطاوارانہ انداز سے کہا، تمہاری انگلیاں توے سے جل جاتی تھیں کہ نہیں؟''

امینہ کا غصہ فوراً شفقت میں تبدیل ہوگیا۔ اور شفقت بھی وہ نہیں جو منہ پر بیان ہوتی ہے اور اپنی ساری تاثیر لفظوں میں منتشر کر دیتی ہے۔ یہ بے زبان شفقت تھی۔ دردِ التجا میں ڈوبی ہوئی۔ اف کتنی نفس کشی ہے۔ کتنی جانسوزی ہے۔ غریب نے اپنے طفلانہ اشتیاق کو روکنے کے لئے کتنا ضبط کیا۔ جب دوسرے لڑکے کھلونے لے رہے ہوں گے، مٹھائیاں کھا رہے ہوں گے، اس کا دل کتنا لہراتا ہوگا۔ اتنا ضبط اس سے ہوا۔ کیونکہ اپنی بوڑھی ماں کی یاد اسے وہاں بھی رہی۔ میرا لال میری کتنی فکر رکھتا ہے۔ اس کے دل میں ایک ایسا جذبہ پیدا ہوا کہ اس کے ہاتھ میں دنیا کی بادشاہت آ جائے اور وہ اسے حامد کے اوپر نثار کر دے۔ اور تب بڑی دلچسپ بات ہوئی۔ بڑھیا امینہ ننھی سی امینہ بن گئی۔ وہ رونے لگی۔ دامن پھیلا کر حامد کو دعائیں دیتی جاتی تھی اور آنکھوں سے آنسو کی بڑی بڑی بوندیں گراتی جاتی تھی۔ حامد اس کا راز کیا سمجھتا اور نہ شاید ہمارے بعض ناظرین ہی سمجھ سکیں گے۔

2.2.2 عیدہ گاہ کا فنی تجزیہ

اردو ادب میں پریم چند کا نام حقیقت نگاری اور انسان دوستی کی علامت ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں کی بنیاد سچائی اور سادگی پر رکھی۔ انہوں نے قاری کو کسی تخیلاتی دنیا کی سیر نہیں کرائی بلکہ ہندوستان کے عام انسانوں اور خصوصا دیہاتی زندگی کے متنوع رنگ اپنے افسانوں میں پیش کئے۔ ان کے شاہکار افسانوں میں ''عیدگاہ'' کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ افسانہ نہ صرف ایک بچے کی معصومیت کی کہانی ہے بلکہ انسانیت، خلوص، اور قربانی کے جذبے کا حسین استعارہ بھی ہے۔

پریم چند کے افسانوں کے پلاٹ سادہ اور زندگی سے قریب تر ہوتے ہیں۔ وہ اپنی کہانیوں کا پلاٹ معاشرے کی تلخ حقیقتوں سے ترتیب دیتے ہیں۔ وہ جس واقعے کو جیسا دیکھتے ہیں اسی طرح پیش کرتے ہیں اور کسی قسم کی رنگینی یا بناوٹ سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کی کہانیاں عام زندگی کے واقعات سے جنم لیتی ہیں۔ افسانہ عیدگاہ کا پلاٹ بھی نہایت مضبوط، حقیقت پسندانہ اور جذباتی تاثر قائم کرنے والا ہے۔ عیدگاہ کے پلاٹ کی اصل خوبی وحدت تاثر ہے۔ یعنی کہانی کے تمام واقعات ایک مرکزی خیال کے گرد گھومتے ہیں اور آپس میں مربوط رہتے ہیں۔

افسانہ عیدگاہ کا آغاز عید کی صبح سے ہوتا ہے۔۔ پورا گاؤں خوشی کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ بچے نئے کپڑے پہنے، جیبوں میں پیسے ڈالے، عیدگاہ جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ان ہی بچوں میں ایک ننھا یتیم بچہ حامد بھی شامل ہے جو اپنی بوڑھی دادی امینہ کے ساتھ رہتا ہے۔ عید کے دن تمام بچے خوشی خوشی عیدگاہ جا رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں پیسے ہیں، جن سے وہ میلے میں مٹھائیاں، کھلونے اور جھولے جھولنے کا سوچ رہے ہیں۔ حامد کے پاس صرف تین پیسے ہیں جو دادی نے بڑی مشکل سے بچا کر رکھے تھے جیسے انسان اپنا ایمان بچا کر رکھتا ہے۔ حامد کے لئے یہ تین پیسے بے حد قیمتی ہیں۔ میلے میں دوسرے بچے جب اپنی خواہشات پوری کر رہے ہوتے ہیں، تو ننھا حامد اپنے دل کو سمجھاتا ہے اور مٹھائیوں یا کھلونوں میں اپنے پیسے ضائع نہیں کرتا۔ اس کے دوست اسے للچاتے ہیں نیز اس کا مذاق بھی اڑاتے ہیں لیکن حامد بڑی بہادری اور سمجھداری کے ساتھ ان کا مقابلہ کرتا ہے اور خود کو کمزور نہیں پڑنے دیتا۔ میلے میں گھومتے ہوئے اچانک حامد کو لوہے کے سامان کی ایک دکان نظر آتی ہے اور وہ عقل و محبت سے ایک فیصلہ کرتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اس کی دادی جب روٹی بناتی ہیں تو توا گرم ہونے کی وجہ سے ان کے ہاتھ جل جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے تین پیسوں سے لوہے کا ایک چمٹا خرید لیتا ہے تاکہ اس کی دادی کے ہاتھ محفوظ رہیں۔

یہی موقع افسانے کا عروج ہے۔ دوسرے بچے جب اس کا مذاق اڑاتے ہیں کہ اس نے ایک بدصورت چمٹا خریدا جس سے کھیلا بھی نہیں جا سکتا، تو حامد بڑے فخر سے کہتا ہے کہ اس کا چمٹا تو اس قدر مضبوط ہے جس کے آگے سپاہی، بہشتی، خنجری اور وکیل کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہاں پریم چند نے حامد کی معصوم عقل کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ جس مدلل طریقے سے اپنے چمٹے کا دفاع کرتا ہے اس سے تمام بچے متاثر ہو جاتے ہیں۔ بساط پلٹ جاتی ہے اور وہی بچے جو اب تک اپنے کھلونوں پر نازاں تھے اور حامد کو کمتر سمجھ رہے تھے اب حامد کے چمٹے کو حسرت کی نگاہوں سے تکنے لگتے ہیں۔ گھر لوٹنے پر جب حامد چ، امینہ کو چمٹا دیتا ہے، تو وہ پہلے حیران ہو جاتی ہے، پھر حامد کے خلوص اور محبت کو دیکھ کر آبدیدہ ہو جاتی ہے۔ یہ منظر افسانے کو روحانی بلندی پر پہنچا دیتا ہے۔

پریم چند نے عیدگاہ میں سماجی تضاد کو بڑی سادگی سے بیان کیا ہے۔ ایک طرف وہ بچے ہیں جو مٹھائیاں اور کھلونے خرید رہے ہیں، اور دوسری طرف حامد ہے جو اپنی غربت کے باوجود اپنی دادی کے لیے سوچتا ہے۔ یہ وہ کردار ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ انسان کی عظمت اس کے دل میں ہے، جیب میں نہیں۔

پریم چند نے اپنے افسانوں میں بہت سے کردار پیش کئے ہیں جو بے حد حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ پریم چند کی زندگی کا بیشتر حصہ غربت میں گزرا لہذا انہوں نے اپنے افسانوں میں عام انسانوں کے جو کردار تخلیق کئے ہیں وہ نہایت فطری معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں متنوع کردار پیش کیے ہیں۔ اپنے کرداروں کی امتیازی خصوصیات کو اجاگر کرنے کے لئے وہ انہیں آزمائشوں کی

کسوٹی پر اتنا کستے ہیں کہ ہر کردار کا اصلی رنگ واضح نظر آنے لگتا ہے۔ افسانہ عیدگاہ میں بھی مرکزی کردار حامد کے ایثار و قربانی کے جذبات کو نمایاں کرنے کے لئے پریم چند نے اسے صبر و برداشت کے کڑے مراحل سے گزارا۔ حامد کا کردار ایک یوں تو ایک معصوم بچہ ہے لیکن اپنے افعال کے باعث وہ ایک میچور اور پرفیکٹ کردار کے طور پر سامنے آتا ہے۔ عموماً بچوں میں ایسی سمجھداری کا ہونا ناممکن سا لگتا ہے لیکن حامد کے ساتھ پیش آنے والے حالات و واقعات نے اسے وقت سے پہلے بردبار بنا دیا ہے اور وہ عام بچوں کی طرح کھیل کود اور میلوں ٹھیلوں کے بجائے اپنی دادی کی سہولت کا سامان خریدنے کو ترجیح دیتا ہے۔ افسانے کا دوسرا مرکزی کردار دادی ہے جو مامتا کی علامت کے طور پر سامنے آتی ہے۔ اس کے علاوہ حامد کے دوستوں محسن، نورے، محمود اور سمیع کے کردار بھی افسانے کی دلچسپی میں اضافہ کرتے ہیں۔ پریم چند نے ان بچوں کے کرداروں کو بڑی فنکاری کے ساتھ تراشا ہے۔ ان کی بحث اور لڑائی جھگڑے نیز میلے میں چیزوں کو دیکھ کر للچانا بے حد فطری معلوم ہوتا ہے۔

پریم چند کا اسلوب نہایت شستہ اور رواں ہوتا ہے۔ مذکورہ افسانے میں بھی زبان نہایت سادہ اور عام فہم ہے۔ انہوں نے بچوں کے مکالمے تخلیق کرتے ہوئے اس بات کا بے حد خیال رکھا کہ ان میں بچپن کا عنصر موجود رہے۔ مکالمہ نگاری میں پریم چند کا فن بے حد نکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ حامد اور اس کے دوستوں کی گفتگو میں بے تکلفی اور فطری انداز بیان سے افسانے میں دلکشی کے ساتھ بڑی زندگی اور توانائی پیدا ہوگئی ہے۔ یوں تو افسانہ ایک گاوں کے پس منظر میں لکھا گیا ہے لیکن پریم چند نے گاؤں کی بولی لکھنے سے احتراز کیا ہے تاکہ افسانے کی روانی متاثر نہ ہو۔

عیدگاہ کی منظر نگاری میں فطری حسن اور دیہی زندگی کی جھلک نمایاں ہے۔ خصوصاً میلے کے ذکر اس حقیقی انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ قاری خود کو چند لمحات کے لئے اسی بھیڑ میں موجود پاتا ہے۔ پریم چند نے کسی جگہ بھی جذبات کو مصنوعی رنگ نہیں دیا، بلکہ حقیقی احساسات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ افسانہ عیدگاہ کا مرکزی خیال یہ ہے کہ حقیقی خوشی دوسروں کو خوش کرنے میں ہے۔ دولت، آسائشیں اور مادی چیزیں وقتی مسرت تو دیتی ہیں، مگر دائمی سکون صرف خلوص میں ہے۔

عیدگاہ ایک ایسا افسانہ ہے جو انسانیت، ممتا، قربانی اور اخلاقی تربیت کا درس دیتا ہے۔ بظاہر یہ ایک بچے کی کہانی ہے جو اپنی خواہشات پوری نہ کر کے دادی کے لئے چمٹا خرید کر لاتا ہے لیکن درحقیقت پریم چند نے اس چھوٹی سی کہانی میں بڑے بڑے انسانی جذبات کو سمو دیا ہے۔ حامد کا چمٹا آج بھی اردو ادب کی تاریخ میں ایثار، محبت اور خلوص کی علامت بن کر زندہ ہے۔

خود اکتسابی کے لیے سوالات I

خالی جگہیں پُر کیجیے۔

1۔ اردو ادب میں پریم چند کا نام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کی علامت ہے۔

2۔ پریم چند کے افسانوں کے پلاٹ ۔۔۔۔۔۔۔۔ اور زندگی سے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہوتے ہے۔

3۔ عید کے دن تمام بچے خوشی خوشی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جا رہے ہیں۔

4۔ پریم چند نے عیدگاہ میں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کو بڑی سادگی سے بیان کیا ہے۔

5۔ عیدگاہ کی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ فطری حسن اور دیہی زندگی کی جھلک نمایاں ہے۔

2.2.3 زبان کی مہارتیں (سننے کے حوالے سے)

زبان کی تعلیم میں چار بنیادی مہارتیں اہم سمجھی جاتی ہیں۔ بولنا، سننا، پڑھنا اور لکھنا۔ ان میں سب سے پہلی اور بنیادی مہارت

سننے کی مہارت ہے، کیونکہ سننا زبان سیکھنے کی اولین شرط ہے۔ بچہ بولنا سیکھنے سے پہلے سنتا ہے، اور سننے ہی کے ذریعے وہ الفاظ، آوازوں، جذبات اور مفاہیم کو پہچاننا سیکھتا ہے۔

ادبی متون، خصوصاً کہانیاں اور افسانے، سننے کی مہارت کے فروغ میں خاص کردار ادا کرتے ہیں، کیونکہ وہ صرف زبان نہیں سکھاتے بلکہ جذباتی اور اخلاقی تربیت بھی کرتے ہیں۔ پریم چند کا افسانہ 'عیدگاہ' اس حوالے سے ایک مثالی نص ہے۔

سننے کی تربیت کا ذریعہ

جب 'عیدگاہ' کو بلند آواز میں پڑھا یا سنایا جاتا ہے، تو سننے والا مختلف صوتی آہنگ (intonation)، جذباتی اتار چڑھاؤ اور کرداروں کی آوازوں سے زبان کے فطری آہنگ کو محسوس کرتا ہے۔

افسانے میں پریم چند نے جو تصویری منظر نگاری کی ہے، مثلاً عید کی صبح، گاؤں کی چہل پہل، بچوں کی ہنسی، اور حامد کی معصوم گفتگو، ان سب کو سن کر سامع زبان کے آہنگ، تال اور لہجے کو بہتر طور پر سمجھ پاتا ہے۔

یہ افسانہ طلبا کے لیے سننے کی مشق بھی ہے اور تلفظ، ادائیگی اور جذباتی اظہار کی تربیت بھی۔

مفہوم فہمی (Comprehension) کی مشق

سننے کی مہارت کا ایک اہم مقصد سمجھ کر سننا ہے۔ جب افسانہ عیدگاہ کی قرأت کی جاتی ہے تو سامع کو یہ جاننا ہوتا ہے کہ:

کہانی کہاں سے شروع ہوئی؟

حامد کا کردار کیسا ہے؟

وہ چمٹا کیوں خریدتا ہے؟

کہانی کے اختتام پر کیا جذبات پیدا ہوتے ہیں؟

یہ سوالات سننے والے کو مرکزی خیال، جزئیات، اور افسانے کے پیغام کو سمجھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

اس طرح افسانہ عیدگاہ سننے سے طالب علم خیالات کو ترتیب دینے، نتیجہ اخذ کرنے، اور زبان کے ربط کو پہچاننے کی مشق کرتے ہیں۔

جذباتی اور اخلاقی فہم میں اضافہ

سننے کے دوران سامع صرف الفاظ نہیں سنتا بلکہ جذبات کو محسوس بھی کرتا ہے۔

جب وہ حامد کو اپنے تین پیسوں سے چمٹا خریدتے سنتا ہے تو دل میں ہمدردی، پیار اور قربانی کے احساسات جاگتے ہیں۔

یہی سننے کی تربیت کا سب سے مؤثر پہلو ہے یعنی زبان کے ذریعے دل کے تاروں کو چھیڑنا۔ یوں عیدگاہ سننے والا طالب علم یا قاری نہ صرف زبان کے الفاظ سیکھتا ہے بلکہ انسانی اقدار کی اہمیت بھی اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔

سماجی اور ثقافتی شعور کی تربیت

'عیدگاہ' ایک سماجی افسانہ ہے جو غریبی اور امیری کے فرق کو نمایاں کرتا ہے۔

جب سننے والا یہ کہانی سنتا ہے تو وہ معاشرتی حقائق، دیہی زندگی، مذہبی تہوار اور انسانی رشتوں کے جذبات سے واقف ہوتا ہے۔

یوں سننے کی مشق صرف زبان کی نہیں بلکہ معاشرتی فہم اور ہمدردی کی تربیت بھی بن جاتی ہے۔ یہ افسانہ سننے والے کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ سچی خوشی دوسروں کی خوشی میں ہے۔

تلفظ اور ادائیگی میں بہتری

اگر افسانہ 'عیدگاہ' استاد یا کسی تربیت یافتہ قاری کے ذریعے سنایا جائے تو اس میں موجود اردو الفاظ کا درست تلفظ، آوازوں کا

اتار چڑھاؤ، اور مکالموں کی ادائیگی سننے والے کے لیے عملی مثال بن جاتی ہے۔

مثلاً جب حامد فخر سے کہتا ہے:

''میرا چمٹا لوہے کا سپاہی ہے!''

تو اس جملے میں موجود جوش اور فخر کا معصوم احساس سننے والے کے دل میں اظہارِ جذبات کا سلیقہ پیدا کرتا ہے۔

تخیل اور توجہ کی افزائش

سننے کی مہارت کا ایک بڑا فائدہ توجہ اور تخیل کی تربیت ہے۔ افسانہ سننے کے دوران طالب علم اپنی توجہ مرکزی خیال پر مرکوز رکھنے کی کوشش کرتا ہے نیز وہ واقعات کی ترتیب اور مکالموں کے ساتھ منظر نگاری کو بھی اپنی توجہ کے دائرے میں رکھتا ہے۔ اسی کے ساتھ طالب علم افسانہ سننے کے دوران اپنی قوت تخیل سے گاؤں، عید کی صبح، دادی پوتے کے پیار، میلے کی گہما گہمی اور بچوں کی حرکات وسکنات کی تصویر بناتا ہے۔ یہ تخیل اس کے ذہن کو تصویری سوچ کی طرف مائل کرتا ہے۔

سننے کے دوران اس کی توجہ برقرار رکھنا، واقعات کی ترتیب سمجھنا، اور جذبات کو محسوس کرنا، یہ سب سننے کی اعلیٰ تربیت کے زمرے میں آتا ہے۔ افسانہ عیدگاہ نہ صرف اردو ادب کا شاہکار ہے بلکہ سننے کی تربیت کے لیے بھی ایک بہترین نص ہے۔ اسے سننے سے زبان کی روانی، مفہوم فہمی، جذباتی گہرائی، اور سماجی شعور میں اضافہ ہوتا ہے۔

حامد کی کہانی سننے والا ہر شخص اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ الفاظ اگر سچے احساس سے ادا ہوں، تو وہ محض آواز نہیں بلکہ درسِ انسانیت بن جاتے ہیں۔ یوں 'عیدگاہ' سننے کی مہارت کو محض لسانی مشق سے اٹھا کر انسانی تجربے کی سطح پر لے آتا ہے۔

2.2.4 قواعد (صفت) افسانہ عیدگاہ کی مثالوں کے ساتھ

صفت کی تعریف

صفت ایسے لفظ کو کہتے ہیں جو کسی اسم یا ضمیر کی خوبی، خامی، حالت یا کیفیت کو ظاہر کرے۔

یعنی وہ لفظ جو کسی چیز یا شخص کے رنگ، صورت، حالت، مقدار یا وصف کے بارے میں بتائے۔ مثلا: اچھا، برا چھوٹا، بڑا، میٹھا، غریب، خوش، بوڑھا، نیا، گرم، نرم وغیرہ۔

ان سب الفاظ سے پتا چلتا ہے کہ اسم (یعنی کوئی شخص یا چیز) کیسا ہے۔

اسم صفت کی چھ اقسام ہوتی ہیں:

۱۔ صفت ذاتی

وہ صفت جو اپنے موصوف کی ذاتی خصوصیات یا فضیلت کو بیان کرے اسے صفت ذاتی کہتے ہیں۔ اسے صفت مشبہ بھی کہتے ہیں۔

مثلا: دانا، شریف، شریر، بہادر، بزدل، امیر، غریب، بیمار اور صحت مند وغیرہ۔

۲۔ صفت تفضیلی

صفت تفضیلی وہ صفت ہے جو دو یا دو سے زیادہ اسموں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح یا فضیلت دینے کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ یعنی اس میں ایک اسم کو دوسرے سے بہتر یا بدتر ظاہر کیا جاتا ہے۔ یہ صفت تفضیل یا موازنہ کے معنی میں استعمال ہوتی ہے اور کسی صفت کی شدت کو بڑھا یا گھٹا کر بیان کرتی ہے۔ مثلا آگرہ، لاہور سے زیادہ خوبصورت ہے۔ ثاقب، حمزہ سے زیادہ بہادر لڑکا ہے۔ عدیل سب سے لائق طالب علم ہے۔

۳۔ صفت نسبتی

یہ وہ صفت ہے جو کسی اسم کا کسی شخص، چیز، علاقے یا جگہ سے نسبت یا تعلق ظاہر کرتی ہے۔ یہ صفت کسی اسم کا تعلق دوسرے اسم سے بیان کرتی ہے اور اس کے آخر میں اکثر یائے نسبتی کا اضافہ ہوتا ہے۔ مثلاً راحت اندوری، حفیظ جالندھری، ملتانی حلوہ، ہندوستانی راجا وغیرہ۔

۴۔صفت عددی

صفت عددی وہ اسم ہے جو کسی اسم کی تعداد یا گنتی کو ظاہر کرے۔ اس میں دو اقسام ہوتی ہیں۔ صفت عددی معین؛ جس میں تعداد بالکل واضح طور پر معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً؛ تین پانچ، دس، سو، ہزار وغیرہ۔ اور صفت عددی غیر معین جس میں تعداد کا درست تعین نہیں ہوتا۔ مثلاً کئی، کچھ، چند، بے شمار، بے حد وغیرہ۔

۵۔صفت مقداری

صفت مقداری وہ صفت ہے جو کسی اسم کی مقدار یا کمیت کو ظاہر کرتی ہے۔ مثلاً: چند کلو آم، پاؤ بھر دودھ، تھوڑی دور، مختصر مدت، بہت دیر، قلیل، کثیر وغیرہ۔

۶۔صفت مقداری معین

صفت مقداری معین وہ صفت ہے جس میں کسی چیز کی مقدار متعین fixed ہوتی ہے۔ یہ کسی شئے کی کمیت کو ایک مخصوص پیمانے یا عدد کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ مثلاً دو کلو آم، چار گز کپڑا، تین کوس دور وغیرہ۔

افسانہ 'عیدگاہ' کی روشنی میں صفتوں کی مثالیں:

پریم چند نے 'عیدگاہ' میں زبان کو بہت سادہ مگر مؤثر رکھا ہے، اور صفتوں کے ذریعے کرداروں، مناظر اور جذبات کو جاندار بنایا ہے۔

ذیل میں کچھ نمایاں مثالیں اور ان کی وضاحت دی جا رہی ہے۔

☆ بدنصیب امینہ (صفت: بدنصیب)

''بدنصیب امینہ اپنی کوٹھری میں بیٹھی رو رہی ہے۔''

یہاں 'بدنصیب' صفت ذاتی ہے، جو دادی امینہ کی غربت اور لاچاری کو ظاہر کرتی ہے۔

پریم چند نے اسی صفت کے ذریعے امینہ کے کردار میں کسمپرسی اور بے بسی کی جھلک دکھائی ہے۔

☆ بے سمجھ لڑکا (صفت: بے سمجھ)

''یہ کیسا بے سمجھ لڑکا ہے کہ دوپہر ہوگئی نہ کچھ کھایا نہ پیا۔''

صفت ذاتی ''بے سمجھ'' یہاں یہاں حامد کی نادانی اور معصومیت بیان کر رہا ہے۔

اسی صفت کے ذریعے کہانی میں حامد کے ایثار اور جذبے کو معنی ملتے ہیں۔

☆ کتنا پیارا، کتنا ٹھنڈا (صفت: کتنا)

''آج سورج دیکھو کتنا پیارا، کتنا ٹھنڈا ہے۔''

یہاں پر لفظ 'کتنا' صفت مقداری غیر معین ہے۔ جو سورج کی خوبصورتی اور اس کی کیفیت کو ظاہر کر رہا ہے۔

اس صفت کو پریم چند نے افسانے میں عید کی صبح کی منظر کشی کے لئے استعمال کیا ہے۔

☆ دو آنے، تین پیسے (صفت: دو، تین)

''حامد کے لئے کچھ نہیں ہے تو دو پیسے کا دودھ تو چاہئے ہی، اب تو کل دو آنے بچ رہے ہیں، تین پیسے حامد کی جیب میں اور پانچ پیسے امینہ کے بٹوے میں۔''

اس جملے میں دو پیسے، تین پیسے اور پانچ پیسے صفت عددی معین کی مثال ہیں۔
اس صفت کا استعمال دادی امینہ کے قلیل پیسوں کے حساب کتاب کے لئے استعمال کیا گیا ہے جس سے امینہ اور حامد کی غربت کی تصویر صاف اور واضح ہو جاتی ہے۔ دادی اس کشمکش میں ہے کہ عید کے دن وہ ان مختصر سے پیسوں کو کس طرح استعمال کرے۔
☆ مختصر سی ٹولی (صفت: مختصر سی)
دہقانوں کی یہ مختصر سی ٹولی اپنی بے سروسامانی سے بے حس اپنی خستہ حالی میں مگر صابر و شاکر چلی جاتی تھی۔
یہاں لفظ مختصر سی صفت مقداری کی مثال ہے جس سے انسانوں کی ایک غیر معین تعداد کا علم ہو رہا ہے لیکن یہ واضح نہیں ہے کہ اس ٹولی میں کتنے افراد شامل ہیں۔
خوب صورت کھلونے (صفت: خوب صورت)
''کتنے خوب صورت کھلونے ہیں۔''
یہ صفت کھلونوں کی کشش بیان کر رہی ہے۔
اس سے کھلونوں کے تئیں بچوں کے شوق اور دلچسپی کا اظہار ہو رہا ہے۔
'عیدگاہ' میں پریم چند نے متنوع صفات کے ذریعے کرداروں اور مناظر کو جیتا جاگتا بنا دیا ہے۔ معصوم، غریب، بوڑھی، خودغرض، لالچی اور نفس کشی جیسے الفاظ نہ صرف لسانی خوبصورتی بڑھاتے ہیں بلکہ کہانی کے جذباتی تاثر کو بھی گہرا کرتے ہیں۔
یوں کہا جا سکتا ہے کہ افسانہ ''عیدگاہ'' میں صفات کا استعمال محض لفظی نہیں بلکہ معنوی اور جذباتی تاثر پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔

خود اکتسابی کے لیے سوالات II

صحیح یا غلط کی نشاندہی کیجیے۔

1۔ زبان کی تعلیم میں چار بنیادی مہارتیں اہم سمجھی جاتی ہیں۔ (صحیح یا غلط)
2۔ ادبی متون سننے کی مہارت میں خاص کردار ادا نہیں کرتے ہیں۔ (صحیح یا غلط)
3۔ سننے کی مہارت کا ایک مقصد سمجھ کر سننا ہے۔ (صحیح یا غلط)
4۔ صفت کسی شئے کے نام کو کہتے ہیں۔ (صحیح یا غلط)
5۔ افسانہ 'عیدگاہ' میں صفات کا استعمال محض لفظی ہے۔ (صحیح یا غلط)

3. الفاظ اور معنی

الفاظ	معنی
احتراز	احتیاط
اخوت	بھائی چارہ
استطاعت	قدرت، صلاحیت
جانسوزی	تکلیف برداشت کرنا
دست پناہ	چمٹا
دہقان	کسان
ذکی الحس	بہت جلد متاثر ہونے والا

زرق برق	چمکیلے
طرزِ عمل	طریق عمل، سلوک، رویہ
عسرت	غریبی
غبی	بے وقوف، کند ذہن
فیاض طبع	سخی، دریا دل
کسم پرسی	بے کسی، بے آسرا ہونا
کوتاہ فہمی	کم عقلی، نادانی
متن	کتاب کی عبارت
متنوع	طرح طرح کا
مذمت	ملامت
مضروب	زخمی
مواضعات	موضع کی جگہ، مقامات، دیہات
نص	واضح دلیل
نفس کشی	خواہشات نفسانی کو روکنا

2.4 خود اکتسابی سوالات کے جوابات

I

1۔ حقیقت نگاری
2۔ سادہ، قریب تر
3۔ عیدگاہ
4۔ سماجی تضاد
5۔ منظر نگاری

II

1۔ صحیح
2۔ غلط
3۔ صحیح
4۔ غلط
5۔ غلط

2.5 خلاصہ

افسانہ اردو ادب کی ایک ایسی نثری صنف ہے جس میں فرضی یا خیالی واقعات، کردار، اور حالات کو حقیقت سے قریب تر کر کے ادبی انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ اسے عام طور پر مختصر نثری کہانی سے تعبیر کیا جاتا ہے جو کسی واقعے، کردار یا خیال کے گرد گھومتی ہے اور قاری پر ایک گہرا تاثر چھوڑتی ہے۔ اردو میں افسانے کا آغاز اس فکر کے ساتھ ہوا کہ سماج کے غیر موزوں رویوں کے خلاف عوام میں بیداری پیدا کی جائے۔ اس کوشش میں بلاشبہ سب سے پہلا نام منشی پریم چند کا ہے جنہوں نے افسانے کے مواد کو فن کی نسبت زیادہ اہمیت دی۔ ان کے افسانے زندگی کی تلخیوں، غربت، ناانصافی اور انسانی دکھوں کی سچی تصویر پیش کرتے ہیں۔ پریم چند کے بیشتر افسانوں میں دیہات کی زندگی کی جھلک نمایاں ہے۔ انہوں نے عام انسانوں، کسانوں، مزدوروں، عورتوں، اور نچلے طبقات کے دکھ درد کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ ان کی زبان سادہ، مؤثر اور عوامی تھی جو قاری کے دل پر براہ راست اثر ڈالتی ہے۔ پریم چند نے اردو افسانے کو نیا رخ دیا۔ انہوں نے رومانی فضا کو ترک کر کے حقیقت نگاری کو بنیاد بنایا۔ ان کے افسانوں ''کفن''، ''پوس کی رات''، ''نمک کا داروغہ''، ''سوا سیر گیہوں''، ''بوڑھی کاکی''، ''دوبیل'' اور ''عیدگاہ'' میں سماجی ناانصافی، بھوک، غربت اور انسانی مجبوریوں کو نہایت حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ پریم چند نے اردو افسانے کو ایک ایسی حقیقت، گہرائی اور انسان دوستی عطا کی جس نے افسانے کو ادب کی ایک مؤثر صنف بنا دیا۔

''عیدگاہ'' منشی پریم چند کے اُن شاہکار افسانوں میں سے ایک ہے جس میں ان کی حقیقت نگاری، انسان دوستی، اور جذبات نگاری اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ یہ افسانہ بظاہر ایک ننھے بچے حامد کی عید کے دن کی سادہ سی کہانی ہے، مگر دراصل اس میں غربت، محبت، ایثار اور خلوص نیت کے گہرے جذبات پوشیدہ ہیں۔ افسانے کا مرکزی کردار حمید ایک یتیم بچہ ہے جو اپنی دادی امینہ کے ساتھ انتہائی غربت میں زندگی گزار رہا ہے۔ عید کے دن جب گاؤں کے سارے بچے خوشی خوشی میلے کی طرف جاتے ہیں، حامد بھی ان کے ساتھ جاتا ہے۔ میلے میں دوسرے بچے کھلونوں، مٹھائیوں، جلیبیوں اور جھولوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں، لیکن حمید اپنی خواہشات کو قربان کر دیتا ہے کیونکہ اس کے پاس صرف تین پیسے تھے۔ وہ اپنے لیے کچھ نہیں خریدتا بلکہ اپنی دادی کے لیے ایک چمٹا خرید لیتا ہے تاکہ روٹی پکاتے وقت اس کی دادی کا ہاتھ نہ جلے۔ بظاہر سادہ سا یہ عمل دراصل محبت، ایثار اور قربانی کی ایک عظیم مثال ہے۔ لوہے کا دست پناہ بچوں کے لئے کوئی دلچسپ چیز نہیں ہے لیکن حامد کے لئے یہ محبت اور ضرورت کا نشان ہے۔ پریم چند نے اس معمولی واقعے کے ذریعے انسانی جذبات کی وہ گہرائی دکھائی ہے جو بڑے بڑے فلسفے بیان نہیں کر سکتے۔ افسانے میں دکھایا گیا ہے کہ محبت اور خلوص کا جذبہ دولت سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ پریم چند نے اس کہانی کے ذریعے دکھایا کہ سچی خوشی انسان کی اپنی ناآسودہ خواہشات کی تکمیل کرنے میں نہیں بلکہ اپنے خونی رشتوں کی خوشی کے لیے اپنی خواہشات کو قربان کرنے میں ہے۔ یہی جذبہ کہانی کا روحانی اور اخلاقی نقطہ عروج ہے۔

افسانے میں منظر نگاری نہایت دل کش ہے۔ عیدگاہ کی صبح، گاؤں کی فضا، بچوں کا جوش، میلے کی رونق، اور حمید کی معصوم سوچ، سب کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ قاری گویا خود کو بھی اس منظر میں شامل محسوس کرتا ہے۔ کردار نگاری بھی نہایت مؤثر ہے۔ امینہ کی ممتا اور حمید کا جذبہ دونوں دل کو چھو لینے والے ہیں۔ پریم چند نے افسانے کی زبان نہایت سادہ، عام فہم اور جذبات سے بھرپور رکھی ہے۔ ان کی تحریر میں تصنع نہیں بلکہ خلوص اور سچائی ہے۔ بچوں کے مکالمے نہایت فطری محسوس ہوتے ہیں جن میں دوستی، لڑائی، حسد اور شوق جیسے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔

''عیدگاہ'' ایک ایسا افسانہ ہے جو قاری کو ہنساتا بھی ہے، رلاتا بھی ہے، اور آخر میں دل میں ایک گہرا تاثر چھوڑ جاتا ہے۔ یہ افسانہ پریم چند کی انسان دوستی اور اخلاقی فکر کا مظہر ہے۔ حمید کا کردار غربت کے باوجود ایک اخلاقی عظمت کی علامت ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ ''عیدگاہ'' اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا اور ہر دور میں قاری کے دل پہ اثر کرتا رہے گا۔

2.6 خود اکتسابی کے لئے مشق

تحریری سرگرمیاں

دیئے گئے جملوں میں صفت، محاورے اور روزمرہ کی شناخت کریں۔

''حامد کا دل بیٹھ گیا۔ کلیجہ مضبوط کر کے بولا، تین پیسے لو گے؟ اور آگے بڑھا کہ دکاندار کی گھرکیاں نہ سنے، مگر دکاندار نے گھرکیاں نہ دیں۔ دست پناہ اس کی طرف بڑھا دیا اور پیسے لے لئے۔ حامد نے دست پناہ کندھے پر رکھ لیا، گویا بندوق ہے اور شان سے اکڑتا ہوا اپنے رفیقوں کے پاس آیا۔ محسن نے ہنستے ہوئے کہا، ''یہ دست پناہ لایا ہے۔ احمق اسے کیا کرو گے؟''

حامد نے دست پناہ کو زمین پر پٹک کر کہا، ''ذرا اپنا بہشتی زمین پر گرا دو، ساری پسلیاں چور چور ہو جائیں گی بچو کی''

محمود، ''تو یہ دست پناہ کوئی کھلونا ہے؟''

حامد، ''کھلونا کیوں نہیں ہے؟ ابھی کندھے پر رکھا، بندوق ہو گیا ہاتھ میں لے لیا فقیر کا چمٹا ہو گیا۔ چاہوں تو اس سے تمہاری ناک پکڑ لوں۔ ایک چمٹا دوں تو تم لوگوں کے سارے کھلونوں کی جان نکل جائے۔ تمہارے کھلونے کتنا ہی زور لگائیں، اس کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ میرا بہادر شیر ہے یہ دست پناہ۔''

سمیع متاثر ہو کر بولا، ''میری خنجری سے بدلو گے؟ دو آنے کی ہے''

حامد نے خنجری کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہا، ''میرا دست پناہ چاہے تو تمہاری خنجری کا پیٹ پھاڑ ڈالے۔ بس ایک چمڑے کی جھلی لگا دی، ڈھب ڈھب بولنے لگی۔ ذرا سا پانی لگے تو ختم ہو جائے۔ میرا بہادر دست پناہ تو آگ میں، پانی میں، آندھی میں، طوفان میں برابر ڈٹا رہے گا۔''

میلہ بہت دور پیچھے چھوٹ چکا تھا۔ دس بج رہے تھے۔ گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ اب دست پناہ نہیں مل سکتا تھا۔ اب کسی کے پاس پیسے بھی تو نہیں رہے، حامد ہے بڑا ہوشیار۔''

کام کا تجربہ:

دیئے گئے اردو جملوں کا انگریزی میں ترجمہ کریں۔

1۔ حامد کا دل بیٹھ گیا۔

2۔ حامد نے دست پناہ کندھے پر رکھ لیا، گویا بندوق ہے اور شان سے اکڑتا ہوا اپنے رفیقوں کے پاس آیا۔

3۔ تمہارے کھلونے کتنا ہی زور لگائیں، اس کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ میرا بہادر شیر ہے یہ دست پناہ۔

4۔ میرا بہادر دست پناہ تو آگ میں، پانی میں، آندھی میں، طوفان میں برابر ڈٹا رہے گا۔''

5۔ میلہ بہت دور پیچھے چھوٹ چکا تھا۔ دس بج رہے تھے۔ گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔

2.7 مشقی سوالات

1۔ پریم چند کا مختصر تعارف دیتے ہوئے ان کے مشہور افسانوں کے نام لکھیے۔

2۔ افسانہ عیدگاہ کا خلاصہ بیان کیجیے۔

3۔ پریم چند کے مشہور افسانہ عیدگاہ کا مرکزی خیال بتائیے۔

4۔ صفت کی تعریف مع اقسام بیان کیجئے نیز افسانہ 'عیدگاہ' کے حوالے سے مثالیں بیان کیجئے۔

5۔ افسانے کو سن کر آپ کے دل و دماغ میں کون سے جذبات و خیالات مرتب ہوئے۔ نوٹ لکھئے۔

2.8 مزید مطالعہ کے لیے کتب

1۔ شمیم حنفی، پریم چند کے منتخب افسانے 'بڑے گھر کی بیٹی' سے 'کفن' تک، انجمن ترقی اردو ہند، ۲۰۰۶

2۔ پروفیسر صغیر افراہیم، پریم چند کی تخلیقات کا معروضی مطالعہ، براؤن بک پبلی کیشنز، ۲۰۱۷

3۔ سید وقار عظیم، افسانہ نگاری، سرسوتی پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد، ۱۹۳۵

4۔ گوپی چند نارنگ، اردو افسانہ روایت اور مسائل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۸

5۔ پریم گوپال متل، پریم چند کے سو افسانے، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۸

اکائی 3 : جامن کا پیڑ، کرشن چندر

ساخت

3.0 مقاصد

3.1 تمہید

3.2 موضوع کی وضاحت

3.2.1 محقق اور نگراں کے ضروری اوصاف

3.2.2 تحقیقی مقالے کے تقاضے

خود اکتسابی کے لیے سوالات I

3.2.3 زبان کی مہارتیں (بولنے کی مہارت)

3.2.3 قواعد (فعل)

خود اکتسابی کے لیے سوالات II

3.3 الفاظ اور معنی

3.4 خود اکتسابی سوالات کے جوابات I

خود اکتسابی سوالات کے جوابات II

3.5 خلاصہ

3.6 خود اکتسابی کے لئے مشق

تحریری سرگرمیاں

کام کا تجربہ

3.7 مشقی سوالات

3.8 مزید مطالعے کے لیے کتب

3.0 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ۔۔۔۔

☆ کرشن چندر کی افسانہ نگاری سے واقف ہوسکیں گے۔

☆ افسانہ جامن کا پیڑ کا فنی تجزیہ کرسکیں گے۔

☆ بولنے کی مہارت اور اس کی اہمیت سے آگاہ ہوسکیں گے۔

☆ افسانے کی روشنی میں فعل اور اس کی اقسام سے واقفیت حاصل کرسکیں گے۔

3.1 تمہید

کرشن چندر اردو کے مشہور افسانہ نگار، ناول نگار اور مزاح نگار تھے۔فکشن کے علاوہ انہوں نے طنزو مزاح، انشائیہ،تنقید، ڈرامہ، رپورتاژاور خاکہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی۔ان کا شمار ترقی پسند تحریک کے صف اول کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔وہ ۲۳ نومبر ۱۹۱۴ کو وزیرآباد،ضلع گجرانوالہ (پنجاب،موجود پاکستان) میں پیدا ہوئے تھے۔ان کے والد گوری شنکر چوپڑا میڈیکل آفیسر تھے۔کرشن چندر کی ابتدائی تعلیم اردواور فارسی میں ہوئی تھی یہی وجہ ہے کہ اردو پر ان کی گرفت بے حد مضبوط تھی۔۱۹۲۹ میں انہوں نے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا اور بعد ازاں ۱۹۳۵ میں انگریزی سے ایم اے کیا۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہی ان کی ادبی سرگرمیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ان کی تحریروں میں انسان دوستی، رومانیت،حقیقت پسندی اور معاشرتی شعور کی جھلک نمایاں ہے۔

کرشن چندر کے افسانے اردو ادب میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ان کے افسانوں کا موضوع صرف محبت یا رومان نہیں ہے بلکہ زندگی کے تلخ حقائق،غربت،طبقاتی ناہمواری،انسان کی مجبوری اور ظلم کے خلاف احتجاج بھی ہے۔وہ اپنے افسانوں میں عام انسانوں کے دکھ،محرومیاں اور جذبات اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ قاری خود کو کہانی کا حصہ محسوس کرنے لگتا ہے۔

کرشن چندر نے سیکڑوں افسانے تحریر کئے۔ان کے مشہور افسانوں کے نام ٹوٹے ہوئے تارے،قیدی،سفید پھول، پورے چاند کی رات،کالو بھنگی، مہالکشمی کا پل،پشاور ایکسپریس،شہزادہ،ان داتا،آدھے گھنٹے کا خدا،دو فرلانگ لمبی سڑک، مینا بازار، غالیچہ اور چاندی کا کمر بند وغیرہ ہیں۔ان کے افسانوی مجموعوں کے نام طلسم خیال،نظارے،زندگی کے موڑ پر، نغمے کی موت،ان داتا، ہم وحشی ہیں،اجنتا سے آگے،شکست کے بعد،ایک روپیہ ایک پھول،دسواں پل اور کالا سورج کے نام اہم ہیں۔انہوں نے بے شمار ناول بھی لکھے جو اردو ادب میں اہمیت کے حامل ہیں۔ان کے مشہور ناولوں کے نام شکست، جب کھیت جاگے،طوفان کی کلیاں،ایک عورت ہزار دیوانے،دادر پل کے بچے، برف کے پھول، میری یادوں کے چنار،ایک وائلن سمندر کے کنارے،مٹی کے گھاؤ، کاغذ کی ناؤ، پانچ لوفر،مہارانی،سونے کا سنسار،محبت بھی قیامت اور فٹ پاتھ کے فرشتے ہیں۔

3.2 موضوع کی وضاحت

3.2.1 افسانہ جامن کا پیڑ (ماخوذ از ریختہ)

صبح جب مالی نے دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ درخت کے نیچے ایک آدمی دبا پڑا ہے۔مالی دوڑا دوڑا چپڑاسی کے پاس گیا، چپڑاسی دوڑا دوڑا کلرک کے پاس گیا،کلرک دوڑا دوڑا سپرنٹنڈنٹ کے پاس گیا،سپرنٹنڈنٹ دوڑا دوڑا باہر لان میں آیا۔منٹوں میں درختوں کے نیچے دبے ہوئے آدمی کے گرد مجمع اکٹھا ہو گیا۔

''بے چارہ! جامن کا پیڑ،کتنا پھل دار تھا!"ایک کلرک بولا۔

"اوراس کی جامنیں کتنی رسیلی ہوتی تھیں۔'' دوسرا کلرک یاد کرتے ہوئے بولا۔

''میں پھلوں کے موسم میں جھولی بھر کے گھر لے جاتا تھا۔"

"میرے بچے اس کی جامنیں کتنی خوشی سے کھاتے تھے۔'' تیسرا کلرک تقریباً آبدیدہ ہو کر بولا۔

" مگر یہ آدمی۔۔!!!"مالی نے دبے ہوئے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں، یہ آدمی۔۔۔۔!" سپرنٹنڈنٹ سوچ میں پڑ گیا۔

''مر گیا ہوگا! اتنا بھاری تنا جس کی پیٹھ پر گرے وہ بچ سکتا ہے؟'' دوسرا چپڑاسی بولا۔

دبے ہوئے آدمی نے بمشکل کراہتے ہوئے کہا۔

''نہیں! میں زندہ ہوں۔''

''درخت کو ہٹا کر اسے جلدی سے نکال لینا چاہیے۔" مالی نے مشورہ دیا۔

''مشکل معلوم ہوتا ہے۔" ایک کاہل اور موٹا چپڑاسی بولا، ''درخت کا تنا بہت بھاری اور وزنی ہے۔"

''کیا مشکل ہے۔" مالی بولا، ''اگر سپرنٹنڈنٹ صاحب حکم دیں تو ابھی پندرہ بیس مالی چپڑاسی، کلرک لگا کر درخت کے نیچے سے دبے ہوئے آدمی کو نکالا جا سکتا ہے۔"

''مالی ٹھیک کہتا ہے۔" بہت سے کلرک ایک دم بول پڑے، "لگاؤ زور، ہم تیار ہیں۔" ایک دم بہت سے لوگ درخت اٹھانے کو تیار ہو گئے۔

''ٹھہرو!!!" سپرنٹنڈنٹ بولا: "میں انڈر سیکریٹری سے مشورہ کر لوں۔"

سپرنٹنڈنٹ انڈر سیکریٹری کے پاس گیا، انڈر سیکریٹری ڈپٹی سیکریٹری کے پاس گیا، ڈپٹی سیکریٹری جوائنٹ سیکریٹری کے پاس گیا، جوائنٹ سیکریٹری چیف سیکریٹری کے پاس گیا۔ چیف سیکریٹری نے جوائنٹ سیکریٹری سے کچھ کہا، جوائنٹ سیکریٹری نے ڈپٹی سیکریٹری سے کہا، ڈپٹی سیکریٹری نے انڈر سیکریٹری سے کہا۔ فائل چلتی رہی۔ اس میں آدھا دن گزر گیا۔

دوپہر کے کھانے پر دبے ہوئے آدمی کے گرد بہت بھیڑ جمع ہو گئی تھی۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ کچھ من چلے کلرکوں نے معاملے کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا، وہ حکومت کے فیصلے کا انتظار کیے بغیر درخت کو خود سے ہٹانے کا تہیہ کر رہے تھے، کہ اتنے میں سپرنٹنڈنٹ فائل لیے بھاگا بھاگا آیا اور بولا:

''ہم لوگ خود سے اس درخت کو نہیں ہٹا سکتے۔ ہم لوگ محکمۂ تجارت سے متعلق ہیں۔ اور یہ درخت کا معاملہ ہے جو محکمۂ زراعت کی تحویل میں ہے۔ اس لیے میں اس فائل کو ارجنٹ مارک کر کے محکمۂ زراعت میں بھیج رہا ہوں۔ وہاں سے جواب آتے ہی درخت کو ہٹا دیا جائے گا۔''

دوسرے دن محکمۂ زراعت سے جواب آ گیا کہ درخت محکمۂ تجارت کے لان میں گرا ہے۔ اس لئے درخت کو ہٹوانے یا نہ ہٹوانے کی ذمہ داری محکمہ؟ تجارت پر عائد ہوتی ہے۔ یہ جواب پڑھ کر محکمۂ تجارت کو غصہ آ گیا۔ انہوں نے فوراً لکھا کہ: پیڑوں کو ہٹوانے یا نہ ہٹوانے کی ذمہ داری محکمۂ زراعت پر عائد ہوتی ہے۔ محکمۂ تجارت کا اس معاملے میں کوئی تعلق نہیں ہے۔

دوسرے دن بھی فائل چلتی رہی۔ شام کو جواب آ گیا کہ ہم اس معاملہ کو ہارٹی کلچرل ڈپارٹمنٹ کے سپرد کر رہے ہیں۔ کیوں کہ یہ ایک پھلدار درخت کا معاملہ ہے اور ایگری کلچرل ڈپارٹمنٹ صرف اناج اور کھیتی باڑی کے معاملہ میں فیصلہ کرنے کا مجاز ہے۔ جامن کا پیڑ ایک پھل دار پیڑ ہے، اس لیے یہ پیڑ ہارٹی کلچرل ڈپارٹمنٹ کے دائرہ اختیار میں آتا ہے۔

تیسرے دن ہارٹی کلچرل ڈپارٹمنٹ سے جواب آ گیا۔ بڑا کڑا جواب تھا، اور طنز آمیز۔ ہارٹی کلچرل ڈپارٹمنٹ کا سیکرٹری ادبی مزاج کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے لکھا تھا: ''حیرت ہے! اس سمے میں جب ہم درخت اگاؤ سکیم بڑے پیمانے پر چلا رہے ہیں، ہمارے ملک میں ایسے سرکاری افسر موجود ہیں جو درختوں کو کاٹنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اور وہ بھی اک پھل دار درخت کو! اور وہ بھی جامن کے درخت کو۔ جس کا پھل عوام بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔ ہمارا محکمہ کسی حالت میں اس پھلدار درخت کو کاٹنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

''اب کیا کیا جائے!!'' ایک منچلے نے کہا۔ "اگر درخت کاٹا نہیں جا سکتا تو اس آدمی کو کاٹ کر نکال لیا جائے۔''

''یہ دیکھئے!'' اس آدمی نے اشارہ سے بتایا، ''اگر اس آدمی کو عین بیچ میں سے، یعنی دھڑ کے مقام سے کاٹا جائے، تو آدمی ادھر

سے ادھر نکل آئے گا۔ آدھا آدمی ادھر سے باہر آجائے گا اور درخت وہیں کا وہیں رہے گا۔"

''مگر اس طرح تو میں مر جاؤں گا۔" دبے ہوئے آدمی نے احتجاج کیا۔

''یہ بھی ٹھیک کہتا ہے۔'' کلرک بولا۔

آدمی کو کاٹنے والی تجویز پیش کرنے والے نے پرزور احتجاج کیا، ''آپ جانتے نہیں ہیں۔ آج کل پلاسٹک سرجری کتنی ترقی کر چکی ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں اگر اس آدمی کو بیچ میں سے کاٹ کر نکال لیا جائے تو پلاسٹک سرجری کے ذریعے دھڑ کے مقام پر اس آدمی کو پھر سے جوڑا جا سکتا ہے۔''

اب کے فائل کو میڈیکل ڈپارٹمنٹ میں بھیج دیا گیا۔ میڈیکل ڈپارٹمنٹ نے اس پر فوراً ایکشن لیا۔ اور جس دن فائل ان کے محکمہ میں پہنچی، اس کے دوسرے ہی دن اپنے محکمے کا سب سے قابل پلاسٹک سرجن تحقیقات کے لیے بھیج دیا۔ سرجن نے دبے ہوئے آدمی کو اچھی طرح ٹٹول کر، اس کی صحت دیکھ کر، خون کا دباؤ، سانس کی آمد و رفت، دل، پھیپھڑوں کی جانچ کر کے رپورٹ بھیج دی:" کہ اس آدمی کا آپریشن تو ہو سکتا ہے، اور آپریشن کامیاب ہو جائے گا، مگر آدمی مر جائے گا۔''

لہٰذا یہ تجویز بھی مسترد کر دی گئی۔

رات کو مالی نے دبے ہوئے آدمی کو دال بھات کھلایا۔ حالاں کہ ان کے چاروں اطراف پولیس کا پہرہ تھا کہ کہیں لوگ قانون کو ہاتھ میں نہ لے لیں۔ درخت کو خود سے ہٹوانے کی کوشش نہ کریں۔ مگر ایک پولیس کانسٹیبل کو رحم آ گیا۔ اس نے مالی کو دبے ہوئے آدمی کو کھانا کھلانے کی اجازت دے دی۔ مالی نے دبے ہوئے آدمی سے کہا،

''تمہاری فائل چل رہی ہے۔ امید ہے کل تک فیصلہ ہو جائے گا۔''

دبا ہوا آدمی کچھ نہیں بولا۔ مالی نے پھر کہا۔

''یہاں تمہارا کوئی وارث ہے تو اس کا اتا پتا دیں۔ میں انہیں خبر دینے کی کوشش کروں گا۔''

''میں لاوارث ہوں۔'' دبے ہوئے آدمی نے بڑی مشکل سے کہا۔

مالی افسوس ظاہر کرتا ہوا وہاں سے ہٹ گیا۔

رات کو مالی نے دبے ہوئے آدمی کے منہ میں کھچڑی کے لقمے ڈالتے ہوئے اسے بتایا۔ ''اب معاملہ اوپر چلا گیا ہے۔۔۔ سنا ہے کل سیکرٹریٹ کے سارے سیکرٹریوں کی میٹنگ ہوگی۔ اس میں تمہارا کیس رکھا جائے گا۔ امید ہے سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔''

دبا ہوا آدمی آہ بھر کے آہستہ سے بولا۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

مالی نے اچنبھے سے منہ میں انگلی دبائی، حیرت سے بولا۔ ''کیا تم شاعر ہو؟''

دبے ہوئے آدمی نے آہستہ سے سر ہلایا۔

دوسرے دن مالی نے چپڑاسی کو بتایا، چپڑاسی نے کلرک کو۔ تھوڑے ہی عرصے میں سیکرٹریٹ میں یہ افواہ پھیل گئی کہ دبا ہوا آدمی شاعر ہے۔ بس پھر کیا تھا، لوگ جوق در جوق شاعر کو دیکھنے کے لیے آنے لگے۔ اس کی خبر شہر میں بھی پھیل گئی۔ اور شام تک محلے محلے سے شاعر جمع ہونا شروع ہو گئے۔ سیکرٹریٹ کا لان بھانت بھانت کے شاعروں سے بھر گیا۔ اور دبے ہوئے آدمی کے گرد ایک مشاعرہ بپا ہو گیا۔ سیکرٹریٹ کے کئی کلرک اور انڈر سیکرٹریز تک، جنہیں شعر و ادب سے لگاؤ تھا۔ وہ رک گئے۔ کچھ شاعر دبے ہوئے آدمی کو اپنی غزلیں اور نظمیں سنانے لگے۔ جب یہ پتہ چلا کہ دبا ہوا آدمی ایک شاعر ہے، تو سیکرٹریٹ کی سب کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ چونکہ دبا ہوا آدمی ایک شاعر ہے۔ لہٰذا اس فائل کا تعلق نہ ایگری کلچرل ڈپارٹمنٹ سے ہے نہ ہارٹی کلچرل ڈپارٹمنٹ سے، بلکہ صرف کلچرل ڈپارٹمنٹ سے

ہے۔کلچرل ڈپارٹمنٹ سے استدعا کی گئی کہ جلد سے جلد اس معاملے کا فیصلہ کر کے اس بدنصیب شاعر کو اس شجرِ سایہ دار سے رہائی دلائی جائے۔

فائل کلچرل ڈپارٹمنٹ کے مختلف شعبوں سے گزرتی ہوئی ادبی اکیڈمی کے سیکریٹری کے پاس پہنچی۔ بے چارہ سیکریٹری اسی وقت اپنی گاڑی میں سوار ہو کر سیکریٹریٹ پہنچا اور دبے ہوئے آدمی سے انٹرویو لینے لگا۔

''تم شاعر ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''جی ہاں!'' دبے ہوئے آدمی نے جواب دیا۔

''کیا تخلص کرتے ہو؟''

''اوس۔''

''اوس!!!'' سیکرٹری زور سے چیخا۔''کیا تم وہی اوس ہو جس کا مجموعہ ''اوس کے پھول'' حال میں ہی شائع ہوا ہے؟"

دبے ہوئے آدمی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کیا تم ہماری اکادمی کے ممبر ہو؟'' سیکرٹری نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''حیرت ہے!'' سیکریٹری زور سے چیخا،" اتنا بڑا شاعر،''اوس کے پھول'' کا مصنف،اور ہماری اکادمی کا ممبر نہیں ہے۔۔!! اف۔۔!اف!! کیسی غلطی ہوگئی ہم سے!! کتنا بڑا شاعر،اور کیسے گوشۂ گمنامی میں دبا پڑا ہے!"

''گمنامی میں نہیں،ایک درخت کے نیچے دبا ہوں۔ براہ کرم مجھے اس درخت کے نیچے سے نکالیے۔''

''ابھی بندوبست کرتا ہوں۔'' سیکریٹری فوراً بولا۔اور فوراً جا کر اس نے اپنے محکمے میں رپورٹ کی۔

دوسرے دن سیکرٹری بھاگا بھاگا شاعر کے پاس آیا اور بولا،''مبارک ہو!! مٹھائی کھلاؤ! ہماری سرکاری اکادمی نے تمہیں اپنی مرکزی کمیٹی کا ممبر چُن لیا ہے۔ یہ لو پروانۂ انتخاب۔''

''مگر مجھے اس درخت کے نیچے سے تو نکالو۔'' دبے ہوئے آدمی نے کراہ کر کہا۔اس کی سانس بڑی مشکل سے چل رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ شدید کرب میں مبتلا ہے۔

''یہ ہم نہیں کر سکتے۔'' سیکریٹری نے جواب دیا۔" حضور! جو ہم کر سکتے تھے،وہ ہم نے کر دیا ہے۔ بلکہ ہم تو یہاں تک کر سکتے ہیں کہ اگر تم مر جاؤ تو تمہاری بیوی کو وظیفہ دے سکتے ہیں۔اگر تم درخواست دو تو،ہم وہ بھی کر سکتے ہیں۔''

''میں ابھی زندہ ہوں۔" شاعر رک رک کر بولا۔''مجھے زندہ رکھو۔''

''مصیبت یہ ہے۔" سرکاری اکادمی کا سیکرٹری ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔''ہمارا محکمہ صرف کلچرل سے متعلق ہے۔ درخت کاٹنے کا معاملہ قلم دوات سے نہیں،آری کلہاڑی سے متعلق ہے۔اس لئے ہم نے فاریسٹ ڈپارٹمنٹ کو لکھ دیا ہے۔اور ارجنٹ لکھا ہے۔"

شام کو مالی نے دبے ہوئے آدمی کو بتایا،''کل فاریسٹ ڈپارٹمنٹ کے آدمی آ کر اس درخت کو کاٹ دیں گے اور تمہاری جان بچ جائے گی۔''

مالی بہت خوش تھا۔دبے ہوئے آدمی کی صحت جواب دے رہی تھی مگر وہ کسی نہ کسی طرح اپنی زندگی کے لئے لڑے جا رہا تھا۔کل تک،صبح تک۔۔۔۔۔کسی نہ کسی طرح اسے زندہ رہنا ہے۔دوسرے دن جب فاریسٹ ڈپارٹمنٹ کے آدمی آری کلہاڑی لے کر پہنچے،تو ان کو درخت کاٹنے سے روک دیا گیا۔معلوم ہوا کہ محکمہ؟ خارجہ سے حکم آیا تھا کہ:اس درخت کو نہ کاٹا جائے۔وجہ یہ تھی کہ اس درخت کو دس سال پہلے حکومت پی ٹونیا کے وزیراعظم نے سیکرٹریٹ کے لان میں لگایا تھا۔اب اگر یہ درخت کاٹا گیا تو اس امر کا شدید اندیشہ ہے کہ حکومت پی ٹونیا سے ہمارے تعلقات ہمیشہ کے لیے بگڑ جائیں گے۔

''مگر ایک یہ آدمی کی جان کا سوال ہے۔'' ایک کلرک غصّہ سے چلّایا۔

''دوسری طرف دو حکومتوں کے تعلقات کا سوال ہے۔'' دوسرے کلرک نے پہلے کلرک کو سمجھایا۔

''اور یہ بھی تو سمجھو کہ حکومت پی ٹو نیا ہماری حکومت کو کتنی امداد دیتی ہے۔ کیا ہم ان کی دوستی کی خاطر ایک آدمی کی زندگی کو بھی قربان نہیں کر سکتے:''

''شاعر کو مر جانا چاہیے۔''

''بلاشبہ!''

انڈر سیکرٹری نے سپرنٹنڈنٹ کو بتایا: ''آج صبح وزیر اعظم دورے سے واپس آئیں گے۔ آج چار بجے محکمہ ؟ خارجہ اس درخت کی فائل ان کے سامنے پیش کرے گا۔ جو وہ فیصلہ دیں گے، وہی سب کو منظور ہوگا۔''

شام کے پانچ بجے خود سپرنٹنڈنٹ شاعر کی فائل لے کر اس کے پاس آیا۔ ''سنتے ہو!''

آتے ہی وہ خوشی سے فائل کو ہلاتے ہوئے چلّایا۔ ''وزیر اعظم نے اس درخت کو کاٹنے کا حکم دیا ہے اور اس واقعہ کی ساری بین الاقوامی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے۔ کل یہ درخت کاٹ دیا جائے گا اور تم اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر لو گے۔'

''سنتے ہو! آج تمہاری فائل مکمل ہوگئی۔'' سپرنٹنڈنٹ نے شاعر کے بازو کو ہلا کر کہا۔

مگر شاعر کا بازو سرد تھا۔ آنکھوں کی پُتلیاں بے جان اور چیونٹیوں کی ایک لمبی قطار اس کے منہ میں جا رہی تھی۔

اس کی زندگی کی فائل بھی مکمل ہو چکی تھی۔

3.2.2 افسانہ 'جامن کا پیڑ' کا فنی جائزہ

کرشن چندر اردو فکشن کے بہت بڑے اور اہم ناموں میں سے ایک ہیں۔ پریم چند کے بعد جو بڑے افسانہ نگار ہوئے ہیں ان میں کرشن چندر کا نام سرفہرست ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ ان کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی حقیقت نگاری ہے جس میں انہوں نے زندگی کی تلخ اور شیریں سچائیوں کو بغیر کسی بناوٹ کے پیش کیا ہے۔ نصاب میں شامل ان کا فسانہ 'جامن کا پیڑ' ایک طنزیہ افسانہ ہے جس میں سرکاری نظام اور بے حسی کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ کرشن چندر نے بڑی سادگی کے ساتھ اس نظام کے مکروہ چہرے سے پردہ اٹھایا ہے جہاں انسانی جان کی قیمت سرکاری کارروائی سے زیادہ سستی ہے۔ یہ افسانہ بے حد معنی خیز ہے۔

کرشن چندر کا افسانہ ''جامن کا پیڑ'' اردو ادب میں طنزیہ حقیقت نگاری کی بہترین مثالوں میں سے ایک ہے۔ یہ افسانہ بظاہر ایک سادہ واقعے پر مبنی ہے، مگر اس کے پس منظر میں پورے سرکاری نظام کی بے حسی، انسانیت کی پامالی اور طبقاتی فرق کی تلخ حقیقتیں پوشیدہ ہیں۔ کرشن چندر نے اپنی مخصوص زبان اور اسلوب کے ذریعے اس معمولی سے واقعے کو اتنی گہرائی سے بیان کیا ہے کہ قاری کے دل پر گہرا اثر چھوڑ جاتا ہے۔

کہانی کی ابتدا ایک طوفانی رات سے ہوتی ہے جب دفتر کے احاطے میں لگا ہوا ایک پرانا جامن کا درخت تیز ہوا کے سبب گر جاتا ہے۔ اتفاق سے اس کے نیچے ایک آدمی دب جاتا ہے۔ مالی سب سے پہلے اس کی مدد کے لیے دوڑتا ہے، لیکن وہ خود کچھ کرنے کے بجائے افسروں کو اطلاع دینے جاتا ہے۔ یوں ایک چھوٹا سا انسانی المیہ سرکاری فائلوں اور محکماتی چکروں میں الجھ جاتا ہے۔ ہر محکمہ اپنی ذمہ داری سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور معاملہ ایک میز سے دوسری میز تک پہنچتا رہتا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ درخت کے نیچے ایک انسان دبا ہوا ہے، مگر کوئی بھی اس کی جان بچانے کے لیے ذاتی اقدام کرنے کو تیار نہیں۔

دوپہر کے کھانے پر دبے ہوئے آدمی کے گرد بہت بھیڑ جمع ہوگئی تھی۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ کچھ من چلے کلرکوں نے معاملے کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا، وہ حکومت کے فیصلے کا انتظار کیے بغیر درخت کو خود سے ہٹانے کا تہیہ کر رہے تھے، کہ اتنے میں

سپرنٹنڈنٹ فائل لیے بھاگا بھاگا آیا اور بولا:

''ہم لوگ خود سے اس درخت کو نہیں ہٹا سکتے۔ ہم لوگ محکمۂ تجارت سے متعلق ہیں۔ اور یہ درخت کا معاملہ ہے جو محکمہ ؟ زراعت کی تحویل میں ہے۔ اس لیے میں اس فائل کو ارجنٹ مارک کر کے محکمہ ؟ زراعت میں بھیج رہا ہوں۔ وہاں سے جواب آتے ہی درخت کو ہٹا دیا جائے گا۔''

افسانے میں کرشن چندر نے بیوروکریسی کی وہ سست روی اور غیر انسانی رویہ دکھایا ہے جس میں انسان کی زندگی سے زیادہ ضابطے، اجازت نامے اور کاغذی کارروائیاں اہم سمجھی جاتی ہیں۔ جب تک اجازت ملتی ہے، وہ آدمی مر چکا ہوتا ہے۔ یعنی جب فائل مکمل ہوتی ہے، تو انسان کی سانسیں ختم ہو چکی ہوتی ہیں۔ یہ جملہ افسانے کا حاصل معلوم ہوتا ہے، جو پورے نظام کی بے معنویت کو ظاہر کرتا ہے۔

کرداروں کے اعتبار سے افسانہ مختصر مگر گہرا ہے۔ دبا ہوا آدمی دراصل عام انسان کی علامت ہے، جو نظام کے بوجھ تلے دب کر رہ جاتا ہے۔ مالی انسانیت اور ہمدردی کا نمائندہ ہے، مگر وہ بھی اپنے اختیار سے کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کے مقابلے میں افسروں کے کردار خودغرض اور رسمی ہیں۔ وہ اپنے عہدے کے دائرے سے باہر قدم رکھنے کو تیار نہیں، چاہے کسی کی جان ہی کیوں نہ جا رہی ہو۔ ایک موقع پر جب معلوم ہوتا ہے کہ دبنے والا آدمی شاعر ہے تو سب افسوس کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی "ادبی حیثیت" پر گفتگو کرنے لگتے ہیں، جیسے انسان کی جان سے زیادہ اس کا سماجی مقام اہم ہو۔

افسانے کی زبان نہایت سادہ اور رواں ہے۔ کرشن چندر نے روزمرہ بول چال کے جملے استعمال کیے ہیں جن سے مکالموں میں حقیقت کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ ان کی تحریر میں طنز کا عنصر نمایاں ہے، مگر یہ طنز کسی سطحی ہنسی کے لیے نہیں بلکہ سوچنے پر مجبور کرنے کے لیے ہے۔ بعض جملے بظاہر مزاحیہ لگتے ہیں لیکن ان میں گہرا درد پوشیدہ ہے۔ جیسے یہ کہنا کہ اگر درخت کاٹنا منع ہے تو آدمی کو کاٹ کر نکال لو، دراصل اس نظام پر زبردست طنز ہے جس میں قانون کی پاسداری انسانیت سے زیادہ اہم ہو جاتی ہے۔

''مگر مجھے اس درخت کے نیچے سے تو نکالو۔'' دبے ہوئے آدمی نے کراہ کر کہا۔ اس کی سانس بڑی مشکل سے چل رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ شدید کرب میں مبتلا ہے۔

''یہ ہم نہیں کر سکتے۔'' سیکریٹری نے جواب دیا۔ "حضور! جو ہم کر سکتے تھے، وہ ہم نے کر دیا ہے۔ بلکہ ہم تو یہاں تک کر سکتے ہیں کہ اگر تم مر جاؤ تو تمہاری بیوی کو وظیفہ دے سکتے ہیں۔ اگر تم درخواست دو تو، ہم وہ بھی کر سکتے ہیں۔''

''میں ابھی زندہ ہوں۔" شاعر رک رک کر بولا۔ ''مجھے زندہ رکھو۔''

افسانے کے آخر میں جب اجازت ملتی ہے کہ درخت کاٹا جائے، تب تک دبے ہوئے آدمی کی موت واقع ہو چکی ہوتی ہے۔ یہ انجام نہ صرف کہانی کا المیہ ہے بلکہ ہمارے سماج کی اخلاقی موت کی علامت بھی ہے۔ کرشن چندر نے اس ایک واقعے کے ذریعے یہ دکھایا کہ ہمارے معاشرے میں انسان کی قیمت فائلوں کے بوجھ تلے دب چکی ہے اور سرکاری مشینری اپنی سختیوں اور ضابطوں میں اس قدر الجھ چکی ہے کہ انسانی جان کی حرمت کہیں گم ہو گئی ہے۔

جامن کا پیڑ ایک علامتی کہانی ہے جو صرف ایک شخص کے دب جانے کی نہیں بلکہ پوری انسانیت کے دب جانے کی داستان ہے۔ اس میں درخت ریاست یا نظام کی علامت بن جاتا ہے اور اس کے نیچے دبا ہوا انسان عوام کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس افسانے کے

ذریعے کرشن چندر نے ہمیں آئینہ دکھایا ہے کہ ہم ایک ایسے نظام کا حصہ بن چکے ہیں جہاں فیصلے فائلوں میں ہوتے ہیں اور زندگیاں کاغذوں کے نیچے دم توڑ دیتی ہیں۔

یہ کہانی آج بھی اتنی ہی معنی خیز ہے جتنی اپنے زمانے میں تھی۔ کیونکہ آج بھی اکثر جگہوں پر انسان کی اہمیت قانون، ضابطے اور اختیار کے نیچے دب جاتی ہے۔ "جامن کا پیڑ" صرف ایک افسانہ نہیں بلکہ سماج اور نظام پر کرشن چندر کا گہرا طنز ہے جو ہمیں انسانیت کی بقا پر غور کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

خود اکتسابی کے لیے سوالات I

خالی جگہیں پُر کیجیے۔

1۔ کرشن چندر کا افسانہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اردو ادب میں طنزیہ حقیقت نگاری کی بہترین مثالوں میں سے ایک ہے۔

2۔ افسانے میں کرشن چندر نے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کی سست روی اور غیر انسانی رویہ دکھایا ہے۔

3۔ افسانے کی زبان نہایت سادہ اور۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔

4۔ یہ انجام نہ صرف کہانی کا المیہ ہے بلکہ ہمارے سماج کی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کی علامت بھی ہے۔

5۔ یہ کہانی آج بھی اتنی ہی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے جتنی اپنے زمانے میں تھی۔

3.2.3 زبان کی مہارتیں (بولنے کے حوالے سے)

زبان کی چار اہم مہارتوں میں سے ایک بولنے کی مہارت یعنی Speaking skill ہے۔ یہ سب سے زیادہ عملی اور فوری طور پر مفید (effective) سمجھی جاتی ہے، کیونکہ اس کے ذریعے انسان اپنے خیالات، احساسات اور تجربات دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ چونکہ افسانہ بھی انسانی زندگی کے تجربات، احساسات اور تعلقات کا آئینہ ہوتا ہے اس لئے بولنے کی مہارت افسانے کی فہم اور تاثر دونوں میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ افسانہ نگار کرداروں کو زبان اور مکالمے کے ذریعے زندگی بخشتا ہے، اگر کسی قاری میں بولنے اور سمجھنے کی مہارت ہو تو وہ کرداروں کے مکالموں، لہجوں اور احساسات کو بہتر طور پر محسوس کر سکتا ہے۔ بولنے کی مہارت افسانے کے مکالماتی پہلو کو سمجھنے اور کرداروں کے باہمی رشتے کو جاننے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ بولنے کی مہارت نہ صرف افسانہ لکھنے بلکہ اسے پڑھنے، سنانے اور پیش کرنے کے حوالے سے بھی بے حد اہم ہے۔

کرشن چندر کے افسانے 'جامن کا پیڑ' کو اگر بولنے کی مہارت کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ افسانہ اظہارِ خیال، مکالمہ، اور لہجے کے حسن کی ایک خوبصورت مثال بن کر سامنے آتا ہے۔ بولنے کی مہارت صرف الفاظ ادا کرنے کا نام نہیں بلکہ اس میں جذبات، لہجہ، اور پیغام کو مؤثر انداز میں پہنچانے کی صلاحیت شامل ہوتی ہے۔ یہی خوبی اس افسانے میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

سب سے پہلے اس افسانے میں مکالمے نہایت فطری اور روزمرہ زبان میں ہیں۔ جب مالی، کلرک یا افسر گفتگو کرتے ہیں تو ان کے الفاظ، اندازِ بیان، اور جملے ان کے طبقے، تعلیم اور رویّے کی جھلک دکھاتے ہیں۔ مثلاً مالی کا سادہ انداز اس کی ہمدردی ظاہر کرتا ہے، جب کہ افسروں کے رسمی جملے ان کی بے حسی اور خود غرضی کو نمایاں کرتے ہیں۔ یہ سب بولنے کی مہارت کے وہ پہلو ہیں جو کسی کردار کو حقیقت سے قریب تر بنا دیتے ہیں۔ مثلا:

''بیچارہ جامن کا یہ پیڑ کتنا پھلدار تھا۔''

''اس کی جامنیں کتنی رسیلی ہوتی تھیں۔''

مذکورہ بالا جملے کلرکوں کے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سیدھے سادے عام انسان ہیں۔

اس افسانے کے مکالمے بولنے کی مشق کے لیے بھی بہت اہم ہیں، کیونکہ ان میں مختلف لہجے، رویّے اور جذبات شامل ہیں۔ ایک طرف مالی کے جملے سادہ اور درد بھری آواز میں بولے جا سکتے ہیں، دوسری طرف افسروں کی باتیں مصنوعی سنجیدگی اور بے پروا لہجے میں۔ اس طرح اگر یہ افسانہ بول کر سنایا جائے تو طالب علم سیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح لہجے کی تبدیلی سے معنی اور تاثر بدل جاتے ہیں۔ مثلاً:

''ہم لوگ خود سے اس درخت کو یہاں سے نہیں ہٹا سکتے۔ ہم لوگ محکمہ تجارت سے متعلق ہیں اور یہ درخت کا معاملہ ہے جو محکمہ زراعت کی تحویل میں ہے۔ اس لئے میں اس فائل کو ارجنٹ مارک کر کے محکمہ زراعت میں بھیج رہا ہوں۔ وہاں سے جواب آتے ہی اس کو ہٹوا دیا جائے گا۔''

اس مکالمے سے ایک سرکاری افسر کی بے حسی صاف ظاہر ہو رہی ہے۔ اس کی نظر میں ایک انسانی جان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ بولنے کی مشق کے دوران ایسے مکالموں سے قاری یا طالب علم مختلف جذبات اور احساسات سے واقفیت حاصل کرتا ہے۔

بولنے کی مہارت کا ایک اہم پہلو جذبات کی ادائیگی ہے۔ 'جامن کا پیڑ' میں قاری یا سامع تبھی متاثر ہوتا ہے جب بیان کرنے والا اس واقعے میں چھپے طنز، درد اور سچائی کو اپنے لہجے میں محسوس کر کے پیش کرے۔ جب راوی یہ جملہ ادا کرتا ہے کہ ''جب فائل مکمل ہوئی تو آدمی مر چکا تھا''، تو اس لمحے کی خاموشی، رکاؤ اور آواز کا درد سامع کے دل تک پہنچتا ہے۔ یہی بولنے کی اصل مہارت ہے۔

اس کے علاوہ، اس افسانے کے ذریعے بولنے کی مشق میں تاثر پیدا کرنے اور پیغام پہنچانے کی تربیت بھی ملتی ہے۔ چونکہ کہانی میں طنز اور سنجیدگی دونوں ہیں، اس لیے بولنے والا سیکھتا ہے کہ ایک ہی تحریر کو کبھی طنزیہ، کبھی دردناک، اور کبھی سنجیدہ انداز میں کس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ افسانہ بلند آواز سے پڑھا جائے تو صحیح تلفظ، لہجہ اور جذباتی اتار چڑھاؤ قرأت کے تاثر کو بڑھا دیتا ہے۔ مثلاً سکریٹری کا یہ جملہ:

''جو ہم کر سکتے تھے وہ ہم نے کر دیا ہے۔ بلکہ ہم تو یہاں تک کر سکتے ہیں
کہ اگر تم مر جاؤ تو تمہاری بیوی کو وظیفہ دلا سکتے ہیں۔ اگر تم درخواست دو تو
ہم یہ بھی کر سکتے ہیں۔''

تدریسی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو 'جامن کا پیڑ' بولنے کی مہارت بڑھانے کے لیے بہترین مواد فراہم کرتا ہے۔ اس کے مکالمے سن کر یا دہرا کر طالب علم اپنی ادائیگی، تلفظ، روانی اور احساس بہتر بنا سکتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ بولنے کا مقصد صرف الفاظ کہنا نہیں بلکہ احساس کو منتقل کرنا ہے۔

بولنے کی مہارت افسانے کو زندگی بخشتی ہے۔ اس کے ذریعے قاری یا سامع کرداروں کے احساسات کو محسوس کرتا ہے۔ منظر کو اپنی آنکھوں کے سامنے لاتا ہے، اور کہانی کے پیغام کو گہرائی سے سمجھتا ہے۔ لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ 'جامن کا پیڑ' بولنے کی مہارت کے لحاظ سے ایک مثالی افسانہ ہے، کیونکہ اس میں زبان کی سادگی، لہجے کی فطری روانی، جذبات کی سچائی، اور طنز کی شدت سب کچھ ایک ساتھ موجود ہے۔ اگر کوئی شخص اس افسانے کو سمجھ کر بولے تو وہ نہ صرف زبان کے استعمال میں مہارت حاصل کرتا ہے بلکہ انسانیت کے درد کو بھی محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہی ادب کا اور بولنے کی اصل مہارت کا مقصد ہے۔

3.2.4 قواعد (فعل اور اس کی اقسام)

فعل: فعل وہ کلمہ ہے جس میں کسی کام کا کرنا یا ہونا پایا جائے اور جس میں تینوں زمانوں حال، ماضی یا مستقبل میں سے کوئی ایک زمانہ موجود ہو۔ یہ کسی کام کی تکمیل یا وقوع کو ظاہر کرتا ہے اور اس کے ساتھ وقت کی قید ہوتی ہے۔ مثلاً: سونا، جاگنا، پڑھنا، لکھنا، بولنا، کھانا اور ہنسنا وغیرہ۔ زمانے کے لحاظ سے فعل کی تین اقسام ہیں۔ فعل ماضی، فعل حال اور فعل مستقبل۔

فعل ماضی: وہ فعل کو کسی گذشتہ (گزرے ہوئے) وقت میں ہونے والے کام کو ظاہر کرے۔
مثلا: علی گیا، میں نے کھانا کھایا، تم آئے۔
فعل ماضی کی دو ذیلی اقسام بھی ہیں۔ ماضی قریب اور ماضی بعید۔
ماضی قریب: وہ فعل یا کام جو کچھ وقت پہلے ہوا ہو یعنی جسے گزرے ہوئے زیادہ وقت نہ ہوا ہو۔
مثلا: میں ابھی کھانا کھا چکا ہوں۔ وہ ابھی ابھی سویا ہے۔
ماضی بعید: وہ فعل یا کام جسے کئے ہوئے زیادہ وقت گزر چکا ہو۔
مثلا: میں نے دو سال پہلے کار خریدی تھی۔ وہ بچپن میں دلی گیا تھا۔
فعل حال: فعل حال اس فعل کو کہتے ہیں جس میں کسی کام کا کرنا یا ہونا موجودہ زمانے میں پایا جائے۔ یعنی وہ کلمہ جو موجودہ وقت میں ہونے والے کام کو ظاہر کرے۔
مثلا۔ چڑیا اڑ رہی ہے۔ تم کھانا کھا رہے ہو۔ بارش ہو رہی ہے وغیرہ۔
فعل مستقبل: وہ فعل جس میں کسی کام کا کرنا یا ہونا آنے والے زمانے میں پایا جائے اسے فعل مستقبل کہتے ہیں۔ یعنی وہ کلمہ جو آئندہ وقت میں ہونے والے کام کو ظاہر کرے۔
مثلا: علی لندن جائے گا۔ تم کیا کھاؤ گے؟۔ میں ابھی نہاؤں گا وغیرہ۔
فعل مستقبل کی بھی دو ذیلی اقسام ہوتی ہیں۔
مستقبل قریب: وہ فعل جو آنے والے وقت میں جلد ہونے والا ہو۔
مثلا: میں ابھی بازار جانے والا ہوں۔ کیا تم میری بات سنو گے؟ وغیرہ۔
مستقبل بعید: وہ فعل جو آنے والے وقت میں زیادہ دن کے بعد ہونے والا ہو۔ یعنی جس کام کے کرنے کا ارادہ کافی بعد میں ہو۔
مثلا: میں اگلے سال گاڑی خریدوں گا۔ تم کب شادی کرو گے وغیرہ۔
مذکورہ بالا قواعد کے حوالے سے افسانہ 'جامن کا پیڑ' بے حد اہم ہے۔ پورے افسانے میں ہم جا بجا مختلف افعال کی خوبصورت مثالیں دیکھ سکتے ہیں۔ سب سے پہلے ہم زمانے کے لحاظ سے متن میں موجود مثالوں کو واضح کریں گے۔
الف) ماضیِ سادہ (ماضیِ وقوع—simple past) ماضی میں وقوع پزیر بالکل مکمل اعمال کے لیے۔
چلا۔ ''رات کو بڑے زور کا جھکڑ چلا۔'' واقعہ بیان کرتا ہے (ہوا کا چلنا ہوا)۔
گر پڑا۔ ''جامن کا ایک درخت گر پڑا۔'' وقوعِ حادثہ۔
دیکھا۔ ''صبح جب مالی نے دیکھا تو.....''۔ ادراک/مشاہدہ۔
پڑا۔ ''ایک آدمی دبا پڑا ہے۔'' حالتِ نتیجہ (متن میں ماضی کے ساتھ حالت)۔
گیا۔ ''مالی دوڑا دوڑا چپراسی کے پاس گیا۔'' نقلِ مکان۔
بولا۔ ''ایک کلرک بولا۔'' مکالمہ (متعدد مقامات پر)۔
کہا۔ ''تیسرے کلرک نے تقریباً آبدیدہ ہو کر کہا۔'' گفتگو کرنا۔
ہوا۔ ''فائل چلتی رہی۔ اسی میں آدھا دن گزر گیا۔'' وقت کا گزرنا۔
آیا۔ ''سپرٹینڈینٹ فائل لیے بھاگا بھاگا آیا۔'' حرکت + وقوع
نوٹ: یہ سب افعال قصّے کی قطار میں ہونے والے واقعات کو ترتیب دیتے ہیں۔ واقعہ، ردِعمل، حرکت وغیرہ

ب)ماضیِ استمراری/ ماضی جاری(habitual past/ past continuous)

وضاحت: کوئی عمل ماضی میں جاری رہنا یا بار ہا ہونا۔

مثالیں:

چلتی رہی۔''فائل چلتی رہی۔'' کارروائی کا تسلسل (بھیڑ کے باوجود کوئی نتیجہ نہیں نکلا، روندِ کار جاری رہا)۔

آنے لگے۔''لوگ جوق در جوق شاعر آنے لگے۔'' سلسلہ وار آمد۔استمرار کا احساس۔

نوٹ: ماضی استمراری افسانے میں بیوروکریسی کی سُست، مسلسل غیر نتیجہ خیز حرکت کو ظاہر کرتا ہے۔

د)مستقبل (گزرے/ بعید نتیجہ کے لیے مستقبل)

وضاحت: آئندہ یا متوقع نتیجہ۔

مثالیں:

ہو جائے گا۔''میں اسے خبر دینے کی کوشش کروں گا۔امید ہے کہ کل تک فیصلہ ہو جائے گا۔'' متوقع نتیجہ/ امید۔

ہو سکتا ہے۔(محتاط امکان)''اس آدمی کا پلاسٹک سرجری کا آپریشن تو ہو سکتا ہے۔'' امکان کی علامت۔

نوٹ: مستقبل کے افعال توقع، امید یا پیش گوئی دکھاتے ہیں—اکثر بیوروکریٹک عمل کے بارے میں۔

ہ)حالت/معروضی افعال(state verbs / participles/ like-passive)

وضاحت: ایسے افعال جو حالت بتاتے ہیں یا ماضی کا نتیجہ ظاہر کرتے ہیں۔

مثالیں:

دبا پڑا ہے۔''ایک آدمی دبا پڑا ہے۔'' حالتِ رواں (نتیجہ۔حادثہ)۔

لاوارث ہوں۔''میں لاوارث ہوں۔'' حالتِ موجود۔

یہ افعال قاری کے ہمدردانہ جذبات اور واقعے کی سنگینی دکھاتے ہیں۔

افسانے کے متن میں جا بجا فعلوں کا فنّی استعمال بھی دیکھا جا سکتا ہے۔کچھ مقامات میں افعال کی تکرار سے شدت پیدا کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔مثلا: دوڑا دوڑا، جوق در جوق، آنے لگے۔متن میں'' دوڑا دوڑا'' جیسی تکرار حرکتی جھٹکے اور ہنگامی کیفیت میں اضافہ کرتی ہے۔قاری کو تیزی کا احساس ہوتا ہے۔اسی طرح مکالموں میں بولنے یا کہنے کے تکرار (بولا، کہا، جواب دیا) سے گفتگو کا تال میل برقرار رہتا ہے اور کرداروں کی فوری ردِعملی حالت کو دکھاتا ہے۔اس سے کہانی کا رنگ زندہ رہتا ہے۔

کچھ جملوں میں فعل، افسانے کی فضا قائم کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔مثلا''فائل چلتی رہی، اسی میں آدھا دن گزر گیا۔'' بیوروکریسی کی سست رفتار، بار بار چلتی ہوئی مگر نتیجہ خیز نہ ہونے والی حرکت واضح ہوتی ہے۔یہ فعلی انتخاب افسانے کے بنیادی موضوع یعنی بیوروکریسی اور انسانی لاچارگی کو نمایاں کرتا ہے۔اسی طرح کچھ افعال سے کرداروں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔مثلا: سپرنٹینڈینٹ کے جملے''میں انڈر سیکریٹری سے مشورہ کر لوں''میں افعال اس کی ذمہ داری منتقل کرنے کی عادت دکھاتے ہیں۔مالی کے''دوبارہ دال بھات کھلایا'' جیسے افعال ہمدردی اور عملی شفافیت دکھاتے ہیں۔اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فعل کردار نگاری میں بے حد معاون ثابت ہوتے ہیں۔اور فعلوں کی ترکیبیں، تکرار اور زمانے کا استعمال یہی دکھاتا ہے کہ افسانہ' جامن کا پیڑ' سماجی تنقید کے ساتھ ساتھ ادب اور قواعد کی رو سے بھی بے حد موثر ہے۔

خود اکتسابی کے لیے سوالات II

صحیح یا غلط کی نشاندہی کیجیے۔

1۔ بولنے کی مہارت افسانے کے مکالماتی پہلو کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ (صحیح یا غلط)
2۔ اس افسانے میں مکالمے نہایت غیر فطری اور مشکل زبان میں ہیں۔ (صحیح یا غلط)
3۔ بولنے کی مہارت کا ایک اہم پہلو جذبات کی ادائیگی ہے۔ (صحیح یا غلط)
4۔ اسم وہ کلمہ ہے جس میں کسی کام کا کرنا یا ہونا پایا جائے۔ (صحیح یا غلط)
5۔ افسانے کے متن میں جا بجا فعلوں کا فنّی استعمال بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ (صحیح یا غلط)

3.3 الفاظ اور معنی

الفاظ	معنی
آری	لکڑی چیرنے کا اوزار
استدعا	گزارش
اندیشہ	خدشہ، ڈر
بھانت بھانت	طرح طرح
پاسداری	دربانی، نگہبانی
پامالی	مسلنا، روندنا، برباد کرنا
تغافل	لاپروائی، غفلت
تہیہ	پختہ ارادہ
جوق در جوق	جھنڈ در جھنڈ، گروہ در گروہ
حرمت	عزت، آبرو، پاکیزگی
خاک ہونا	تباہ ہونا، برباد ہونا
درخت	پیڑ
رغبت	شوق
زراعت	کھیتی باڑی
شفافیت	کسی چیز کا صاف شفاف ہونا
علامت	نشانی، اشارہ
قانون ہاتھ میں لینا	قانون توڑنا، غیر قانونی حرکت کرنا
کرب	دکھ، تکلیف
کلہاڑی	لکڑی کاٹنے کا اوزار

متوقع	جس کی توقع ہو
مسترد کرنا	نامنظور کرنا، رد کرنا
نتیجہ خیز	اثر انگیز، مؤثر
وظیفہ	مقررہ رقم، تنخواہ

3.4 خود اکتسابی سوالات کے جوابات

I

1۔ جامن کا پیڑ

2۔ بیوروکریسی

3۔ رواں

4۔ اخلاقی موت

5۔ معنی خیز

II

1۔ صحیح

2۔ غلط

3۔ صحیح

4۔ غلط

5۔ صحیح

3.5 خلاصہ

کرشن چندر اردو ادب کے نامور افسانہ نگار تھے۔ ان کی افسانہ نگاری رومانویت اور حقیقت کا بہترین امتزاج ہے۔ انہوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو نہایت سادگی، حقیقت پسندی اور گہرے احساس کے ساتھ اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ ان کے افسانوں میں انسان دوستی، ہمدردی، سماجی شعور اور طنز و مزاح کا خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔ وہ عام انسان کے دکھ، درد اور محرومی کو اپنی کہانیوں میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ افسانہ قاری کے دل پر اثر چھوڑ جاتا ہے۔ ان کے اسلوب میں سلاست، مکالموں میں فطری روانی اور بیان میں جذبات کی صداقت نمایاں ہے۔ ابتدائی دور میں انہوں نے رومانی کہانیاں لکھی تھیں لیکن بعد میں انہوں نے شہری زندگی کے مسائل اور ناانصافیوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنالیا تھا۔ مذکورہ افسانہ 'جامن کا پیڑ' اس کی بہترین مثال ہے۔

یہ افسانہ بیوروکریسی کے غیر انسانی نظام، سرکاری اداروں کی غفلت اور انسانی بے حسی پر طنزیہ روشنی ڈالتا ہے۔ کہانی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ سیکریٹریٹ کے لان میں ایک طوفان کے بعد ایک پرانا جامن کا درخت گر جاتا ہے۔ صبح مالی کو معلوم ہوتا ہے کہ اس درخت کے نیچے ایک کلرک دب گیا ہے۔ وہ فوراً افسران کو اطلاع دیتا ہے، لیکن ہر دفتر والا کام دوسرے محکمے کے سپرد کر دیتا ہے۔ کوئی محکمہ

درخت ہٹانے کو تیار نہیں ہوتا۔ فائلیں ایک دفتر سے دوسرے دفتر منتقل ہوتی رہتی ہیں اور یوں پورا عمل تاخیر کا شکار ہوتا جاتا ہے۔ آخر کار جب درخت ہٹایا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ نیچے دبے ہوئے کلرک کی لاش سڑ چکی ہے۔

یہ افسانہ انسان کی بے قدری، سرکاری نظام کی سستی اور فائلوں کی سیاست پر گہرا طنز ہے۔ کرشن چندر نے اس چھوٹی سی کہانی کے ذریعے پورے سماجی ڈھانچے کی ناکامی کو بے نقاب کر دیا ہے۔ ان کے مکالمے نہایت فطری ہیں اور بیوروکریسی کے مزاحیہ مگر افسوسناک پہلو کو واضح کرتے ہیں۔

'جامن کا پیڑ' میں بولنے کی مہارت کی اہمیت بھی نمایاں ہے۔ افسانے کے کرداروں کے مکالمے ان کی ذہنی کیفیت اور سماجی رویے کو ظاہر کرتے ہیں۔ اگر قاری میں بولنے اور سننے کی سمجھ ہو تو وہ ان مکالمات کی طنزیہ نوعیت اور معنی کی گہرائی کو بہتر طور پر محسوس کر سکتا ہے۔

"جامن کا پیڑ" کرشن چندر کی فنی مہارت اور سماجی بصیرت کا بہترین نمونہ ہے۔ انہوں نے ایک عام واقعے کے ذریعے پورے نظام کی بے حسی کو طنز کے پردے میں بیان کیا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری میں حقیقت نگاری، طنز، جذبات اور مکالمے کی قوت سب یکجا ہو کر قاری پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔

3.6 خود اکتسابی کے لئے مشق

تحریری سرگرمیاں

دیئے گئے اقتباس میں فعل، روزمرہ اور محاوروں کی نشاندہی کریں۔

''رات کو مالی نے دبے ہوئے آدمی کے منہ میں کھچڑی کے لقمے ڈالتے ہوئے اسے بتایا۔''اب معاملہ اوپر چلا گیا ہے..... ہے کل سیکرٹریٹ کے سارے سیکرٹریوں کی میٹنگ ہوگی۔ اس میں تمہارا کیس رکھا جائے گا۔ امید ہے سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔''

دبا ہوا آدمی آہ بھر کے آہستہ سے بولا۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

مالی نے اچنبھے سے منہ میں انگلی دبائی، حیرت سے بولا۔''کیا تم شاعر ہو؟''

دبے ہوئے آدمی نے آہستہ سے سر ہلایا۔

دوسرے دن مالی نے چپڑاسی کو بتایا، چپڑاسی نے کلرک کو۔ تھوڑے ہی عرصے میں سیکرٹریٹ میں یہ افواہ پھیل گئی کہ دبا ہوا آدمی شاعر ہے۔ بس پھر کیا تھا، لوگ جوق در جوق شاعر کو دیکھنے کے لیے آنے لگے۔ اس کی خبر شہر میں بھی پھیل گئی۔ اور شام تک محلے محلے سے شاعر جمع ہونا شروع ہو گئے۔ سیکرٹریٹ کا لان بھانت بھانت کے شاعروں سے بھر گیا۔ اور دبے ہوئے آدمی کے گرد ایک مشاعرہ بپا ہو گیا۔ سیکرٹریٹ کے کئی کلرک اور انڈر سیکرٹریز تک، جنہیں شعر و ادب سے لگاؤ تھا۔ وہ رک گئے۔ کچھ شاعر دبے ہوئے آدمی کو اپنی غزلیں اور نظمیں سنانے لگے۔ جب یہ پتہ چلا کہ دبا ہوا آدمی ایک شاعر ہے، تو سیکرٹریٹ کی سب کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ چونکہ دبا ہوا آدمی ایک شاعر ہے۔ لہٰذا اس فائل کا تعلق نہ ایگری کلچرل ڈپارٹمنٹ سے ہے نہ ہارٹی کلچرل ڈپارٹمنٹ سے، بلکہ صرف کلچرل ڈپارٹمنٹ سے ہے۔ کلچرل ڈپارٹمنٹ سے استدعا کی گئی کہ جلد سے جلد اس معاملے کا فیصلہ کر کے اس بدنصیب شاعر کو اس شجرِ سایہ دار سے رہائی دلائی جائے۔''

کام کا تجربہ

دیئے گئے انگریزی جملوں کا اردو میں ترجمہ کریں:

1. At night , the gardener, while putting khichdi in the supressed man's mouth, told him.

2. The man nodded slowly.

3. In a short time the rumor spread in the secretariat, that the supressed man is a poet.

4. The lawn of the secretariat was filled with many kinds of poets.

5. Some poets started reciting their ghazals and poems to the supressed man.

3.7 مشقی سوالات

1۔کرشن چندر کا تعارف کراتے ہوئے ان کے اہم افسانوں کے نام بتائیں۔

2۔افسانہ 'جامن کا پیڑ' کا فنی تجزیہ پیش کریں۔

3۔بولنے کی مہارت کی اہمیت واضح کرتے ہوئے افسانے کے حوالے سے اس کا تجزیہ کریں۔

4۔فعل کی تعریف کرتے ہوئے افسانے میں اس کی مثالیں واضح کریں۔

5۔کرشن چندر کا افسانہ پڑھ کر آپ نے کیا رائے قائم کی۔اپنا نظریہ بیان کریں۔

3.8 مزید مطالعے کے لئے کتب

1۔بیگ احساس، کرشن چندر، شخصیت اور فن، وسنتا گرافکس، حیدرآباد، ۱۹۹۹

2۔علی احمد فاطمی، کرشن چندر فکر و فن، انجمن ترقی اردو ہند، دلی، ۲۰۱۴

3۔جگدیش چندر ودھان، کرشن چندر شخصیت اور فن، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۳

4۔محمد غیاث الدین، فنکار کرشن چندر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۵

5۔نند کشور وکرم، کرشن چندر، اردو کادمی دہلی، ۲۰۱۴

اکائی 4 : ٹوبہ ٹیک سنگھ، سعادت حسن منٹو

ساخت

4.0 مقاصد

4.1 تمہید

4.2 موضوع کی وضاحت

4.2.1 ٹوبہ ٹیک سنگھ (متن)

4.2.2 افسانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کا فنی تجزیہ

خود اکتسابی کے لیے سوالات I

4.2.3 زبان کی مہارتیں (لکھنے کے حوالے سے)

4.2.3 قواعد (فاعل، مفعول)

خود اکتسابی کے لیے سوالات II

4.3 الفاظ اور معنی

4.4 خود اکتسابی سوالات کے جوابات I

خود اکتسابی سوالات کے جوابات II

4.5 خلاصہ

4.6 خود اکتسابی کے لئے مشق

تحریری سرگرمیاں

کام کا تجربہ

4.7 مشقی سوالات

4.8 مزید مطالعے کے لیے کتب

4.0 مقاصد

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ۔۔۔۔۔

☆ سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری سے واقف ہوسکیں گے۔

☆ افسانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے فنی تجزیہ سے آگاہ ہوسکیں گے۔

☆ لکھنے کی مہارت کی اہمیت افسانے کے حوالے سے جان سکیں گے۔

☆ فاعل اور مفعول کی باریکیوں سے واقف ہوسکیں گے۔

4.1 تمہید

سعادت حسن منٹو اردو ادب کا وہ افسانہ نگار ہے جس نے حقیقت کو اس کی تمام تر سفاکیوں کے ساتھ اپنی تحریروں میں پیش کیا۔ منٹو کی پیدائش ۱۱ مئی ۱۹۱۲ میں لدھیانہ، پنجاب میں ہوئی تھی۔ ان کے والد کا نام مولوی غلام حسین تھا۔ منٹو بچپن سے بے حد کھلنڈرے اور شریر مزاج کے تھے اور پڑھائی لکھائی کی طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میٹرک میں دو بار فیل ہونے کے بعد تیسری بار میں تھرڈ ڈویژن سے امتحان پاس کیا۔ طرہ یہ کہ وہ اردو میں ہی فیل ہو جاتے تھے۔ میٹرک کے بعد انہیں مزید تعلیم کے لئے علی گڑھ بھیجا گیا لیکن وہاں سے بعض وجوہات کی بنا پر انہیں واپس کر دیا گیا۔ واپس آ کر انہوں نے امرتسر میں ہی ایف اے میں داخلہ لے لیا۔ اسی زمانے میں آوارہ دوستوں کی بدولت انہیں شراب نوشی کی لت لگ گئی جو آخر عمر تک قائم رہی۔ ۱۸ جنوری ۱۹۵۵ کو ان کا انتقال ہو گیا۔

منٹو نے نہایت تلخی کے ساتھ سماج کے سڑتے ہوئے زخموں سے پردہ اٹھایا اور اپنے قلم سے ان کی جراحی کرنا شروع کی۔ ان کی بعض کہانیوں پر فحش نگاری کا الزام بھی لگا اور اس سلسلے میں ان پر مقدمہ بھی کیا گیا لیکن وہ اپنی حق گوئی اور بے باکی سے باز نہ آئے۔ وہ انسان کی کمزوریوں کو دیکھتے تھے اور انہیں اپنے افسانوں میں پیش کر دیتے تھے۔ انہوں نے حقیقت اور زندگی کو ایک دوسرے کے آمنے سامنے کر دیا۔ ان کے افسانوں میں انسانی نفسیات، طبقاتی تفاوت اور تقسیم ہند کے درد کو نہایت شدت کے ساتھ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کی تحریروں میں معاشرے کے اصل چہرے کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے کردار عام زندگی کے گلی کوچوں، کوٹھوں اور گندے محلے سے تخلیق ہوتے ہیں جنہیں یہ نام نہاد سماج حقیر نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ان کے افسانوں میں عورت بھی تمام تر ذہنی، جذباتی، نفسیاتی اور جسمانی زاویوں سے سامنے آتی ہے۔

منٹو کے افسانوں میں طنز اور احتجاج اپنی پوری شدت کے ساتھ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ وہ سماج کی منافقت پر واضح الفاظ میں طنز کرتے ہیں اور مذہبی و اخلاقی دوغلے پن کو بے نقاب کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کہانیوں میں انسان کے اندر چھپی ہوئی حیوانیت کا کریہہ چہرہ اجاگر کیا۔ اس کوشش میں کہیں کہیں ان کا قلم بے باک ہو جاتا ہے لیکن ان کا مقصد بے حیائی یا فحاشی پھیلانا نہیں تھا بلکہ وہ سچائی کو بے نقاب کرنا چاہتے تھے اور معاشرے کی برائیوں کو چھپانے کے بجائے اسے ختم کرنا چاہتے تھے۔

سعادت حسن منٹو نے اپنی زندگی میں تقریباً ۲۷۰ افسانے لکھے۔ ان کا موازنہ اکثر روسی ادیب چیخوف سے کیا جاتا ہے۔ ان کے مشہور افسانوں میں ٹھنڈا گوشت، سیاہ حاشیے، ٹوبہ ٹیک سنگھ، کالی شلوار، موزیل، ہتک، بو، کھول دو، دھواں، بابو گوپی ناتھ، نیا قانون، خوشیا، خالی بوتلیں خالی ڈبے اور پھاہا وغیرہ ہیں۔ ذیل میں ہم ان کے افسانہ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' کے بارے میں پڑھیں گے جو تقسیم ہند کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔

4.2 موضوع کی وضاحت

4.2.1 افسانہ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' (ماخوذ از کلیات منٹو)

بٹوارے کے دو تین سال بعد پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کو خیال آیا کہ اخلاقی قیدیوں کی طرح پاگلوں کا تبادلہ بھی ہونا چاہیے یعنی جو مسلمان پاگل، ہندوستان کے پاگل خانوں میں ہیں انھیں پاکستان پہنچا دیا جائے اور جو ہندو اور سکھ، پاکستان کے پاگل خانوں میں ہیں انھیں ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے۔

معلوم نہیں یہ بات معقول تھی یا غیر معقول، بہر حال دانش مندوں کے فیصلے کے مطابق ادھر ادھر اونچی سطح کی کانفرنسیں ہوئیں اور بالآخر ایک دن پاگلوں کے تبادلے کے لیے مقرر ہو گیا۔ اچھی طرح چھان بین کی گئی۔ وہ مسلمان پاگل جن کے لواحقین ہندوستان ہی میں تھے، وہیں رہنے دیے گئے تھے۔ جو باقی تھے، ان کو سرحد پر روانہ کر دیا گیا۔ یہاں پاکستان میں چونکہ قریب قریب تمام ہندو، سکھ جا چکے تھے اسی لیے کسی کو رکھنے رکھانے کا سوال ہی نہ پیدا ہوا۔ جتنے ہندو، سکھ پاگل تھے سب کے سب پولیس کی حفاظت میں بارڈر پر پہنچا

دیے گئے۔

ادھر کا معلوم نہیں، لیکن ادھر لاہور کے پاگل خانے میں جب اس تبادلے کی خبر پہنچی تو بڑی دلچسپ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ایک مسلمان پاگل جو بارہ برس سے ہر روز باقاعدگی کے ساتھ 'زمیندار' پڑھتا تھا، اس سے جب اس کے ایک دوست نے پوچھا، ''مولبی ساب! یہ پاکستان کیا ہوتا ہے؟'' تو اس نے بڑے غور و فکر کے بعد جواب دیا، ''ہندوستان میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں استرے بنتے ہیں۔'' یہ جواب سن کر اس کا دوست مطمئن ہو گیا۔

اسی طرح ایک سکھ پاگل نے ایک دوسرے سکھ پاگل سے پوچھا، ''سردار جی ہمیں ہندوستان کیوں بھیجا رہا ہے۔۔۔ ہمیں تو وہاں کی بولی نہیں آتی۔''

دوسرا مسکرایا، ''مجھے تو ہندوستوڑوں کی بولی آتی ہے۔۔۔ ہندوستانی بڑے شیطانی، اکڑا اکڑ پھرتے ہیں۔''

ایک دن نہاتے نہاتے ایک مسلمان پاگل نے ''پاکستان زندہ باد'' کا نعرہ اس زور سے بلند کیا کہ فرش پر پھسل کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

بعض پاگل ایسے بھی تھے جو پاگل نہیں تھے۔ ان میں اکثریت ایسے قاتلوں کی تھی جن کے رشتہ داروں نے افسروں کو دے دلا کر، پاگل خانے بھجوا دیا تھا کہ پھانسی کے پھندے سے بچ جائیں۔ یہ کچھ کچھ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کیوں تقسیم ہوا ہے اور یہ پاکستان کیا ہے۔ لیکن صحیح واقعات سے وہ بھی خبر تھے۔ اخباروں سے کچھ پتا نہیں چلتا تھا اور پہرہ دار سپاہی ان پڑھ اور جاہل تھے۔ ان کی گفتگوؤں سے بھی وہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ایک آدمی محمد علی جناح ہے جس کو قائداعظم کہتے ہیں۔ اس نے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ملک بنایا ہے جس کا نام پاکستان ہے۔۔۔ یہ کہاں ہے، اس کا محل وقوع کیا ہے، اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پاگل خانے میں وہ سب پاگل جن کا دماغ پوری طرح ماؤف نہیں ہوا تھا، اس مخمصے میں گرفتار تھے کہ وہ پاکستان میں ہیں یا ہندوستان میں۔۔۔ اگر ہندوستان میں ہیں تو پاکستان کہاں ہے! اگر وہ پاکستان میں ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ عرصے پہلے یہیں رہتے ہوئے بھی ہندوستان میں تھے!

ایک پاگل تو پاکستان اور ہندوستان، اور ہندوستان اور پاکستان کے چکر میں کچھ ایسا گرفتار ہوا کہ اور زیادہ پاگل ہو گیا۔ جھاڑو دیتے ایک دن درخت پر چڑھ گیا اور ٹہنی پر بیٹھ کر دو گھنٹے مسلسل تقریر کرتا رہا جو پاکستان اور ہندوستان کے نازک مسئلے پر تھی۔ سپاہیوں نے اسے نیچے اترنے کو کہا تو وہ اور اوپر چڑھ گیا۔ ڈرایا دھمکایا گیا تو اس نے کہا، ''میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ پاکستان میں۔۔۔ میں اس درخت پر ہی رہوں گا۔''

بڑی مشکلوں کے بعد جب اس کا دورہ سرد پڑا تو وہ نیچے اترا اور اپنے ہندو سکھ دوستوں سے گلے مل مل کر رونے لگا۔ اس خیال سے اس کا دل بھر آیا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر ہندوستان چلے جائیں گے۔

ایک ایم۔ ایس۔ سی۔ پاس ریڈیو انجینئر میں، جو مسلمان تھا اور دوسرے پاگلوں سے بالکل الگ تھلگ، باغ کی ایک خاص روش پر، سارا دن خاموش ٹہلتا رہتا تھا، یہ تبدیلی نمودار ہوئی کہ اس نے تمام کپڑے اتار کر دفعدار کے حوالے کر دیے اور ننگ دھڑنگ سارے باغ میں چلنا پھرنا شروع کر دیا۔

چنیوٹ کے ایک موٹے مسلمان پاگل نے جو مسلم لیگ کا سرگرم کارکن رہ چکا تھا اور دن میں پندرہ سولہ مرتبہ نہایا کرتا تھا، یک لخت یہ عادت ترک کر دی۔ اس کا نام محمد علی تھا۔ چنانچہ اس نے ایک دن اپنے جنگلے میں اعلان کر دیا کہ وہ قائداعظم محمد علی جناح ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی ایک سکھ پاگل ماسٹر تارا سنگھ بن گیا۔ قریب تھا کہ اس جنگلے میں خون خرابہ ہو جائے مگر دونوں کو خطرناک پاگل قرار دے کر علیحدہ علیحدہ بند کر دیا گیا۔

لاہور کا ایک نوجوان ہندو وکیل تھا جو محبت میں ناکام ہو کر پاگل ہو گیا تھا۔ جب اس نے سنا کہ امرتسر ہندوستان میں چلا گیا ہے

تو اسے بہت دکھ ہوا۔ اسی شہر کی ایک ہندو لڑکی سے اسے محبت ہوئی تھی۔ گو اس نے اس وکیل کو ٹھکرا دیا تھا، مگر دیوانگی کی حالت میں بھی وہ اس کو نہیں بھولا تھا۔ چنانچہ وہ ان تمام ہندو اور مسلم لیڈروں کو گالیاں دیتا تھا جنہوں نے مل ملا کر ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دیے۔۔۔ اس کی محبوبہ ہندوستانی بن گئی اور وہ پاکستانی۔

جب تبادلے کی بات شروع ہوئی تو وکیل کو کئی پاگلوں نے سمجھایا کہ وہ دل برا نہ کرے، اس کو ہندوستان بھیج دیا جائے گا۔ اس ہندوستان میں جہاں اس کی محبوبہ رہتی ہے۔ مگر وہ لاہور چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اس لیے کہ اس کا خیال تھا کہ امرتسر میں اس کی پریکٹس نہیں چلے گی۔

یورپین وارڈ میں اینگلو انڈین پاگل تھے۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ ہندوستان کو آزاد کر کے انگریز چلے گئے ہیں تو ان کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ چھپ چھپ کر گھنٹوں آپس میں اس اہم مسئلے پر گفتگو کرتے رہتے کہ پاگل خانے میں اب ان کی حیثیت کس قسم کی ہوگی۔ یورپین وارڈ رہے گا یا اڑا دیا جائے گا۔ بریک فاسٹ ملا کرے گا یا نہیں۔ کیا انھیں ڈبل روٹی کے بجائے بلڈی انڈین چپاتی تو زہر مار نہیں کرنا پڑے گی۔

ایک سکھ تھا جس کو پاگل خانے میں داخل ہوئے پندرہ برس ہو چکے تھے۔ ہر وقت اس کی زبان سے یہ عجیب و غریب الفاظ سننے میں آتے تھے۔ ''اوپڑ دی گڑ گڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال اف دی لالٹین۔'' دن کو سوتا تھا نہ رات کو۔ پہریداروں کا یہ کہنا تھا کہ پندرہ برس کے طویل عرصے میں وہ ایک لحظے کے لیے بھی نہیں سویا۔ لیٹا بھی نہیں تھا۔ البتہ کبھی کبھی کسی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لیتا تھا۔

ہر وقت کھڑا رہنے سے اس کے پاؤں سوج گئے تھے۔ پنڈلیاں بھی پھول گئی تھیں، مگر اس جسمانی تکلیف کے باوجود لیٹ کر آرام نہیں کرتا تھا۔ ہندوستان، پاکستان اور پاگلوں کے تبادلے کے متعلق جب کبھی پاگل خانے میں گفتگو ہوتی تھی وہ غور سے سنتا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا تھا کہ اس کا کیا خیال ہے تو وہ بڑی سنجیدگی سے جواب دیتا، ''اوپڑ دی گڑ گڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف دی پاکستان گورنمنٹ۔''

لیکن بعد میں ''آف دی پاکستان گورنمنٹ'' کی جگہ ''آف دی ٹوبہ ٹیک سنگھ گورنمنٹ'' نے لے لی اور اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے جہاں کا وہ رہنے والا ہے۔ لیکن کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ جو بتانے کی کوشش کرتے تھے، خود اس الجھاؤ میں گرفتار ہو جاتے تھے کہ سیالکوٹ پہلے ہندوستان میں ہوتا تھا پر اب سنا ہے کہ پاکستان میں ہے، کیا پتہ ہے کہ لاہور جو اب پاکستان میں ہے کل ہندوستان میں چلا جائے۔ یا سارا ہندوستان ہی پاکستان بن جائے اور یہ بھی کون سینے پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کسی دن سرے سے غائب ہی ہو جائیں۔

اس سکھ پاگل کے کیس چھدرے ہو کر بہت مختصر رہ گئے تھے۔ چونکہ بہت کم نہاتا تھا، اس لیے داڑھی اور سر کے بال آپس میں جم گئے تھے، جس کے باعث اس کی شکل بڑی بھیانک ہو گئی تھی۔ مگر آدمی بے ضرر تھا۔ پندرہ برسوں میں اس نے کبھی کسی سے جھگڑا فساد نہیں کیا تھا۔ پاگل خانے کے جو پرانے ملازم تھے، وہ اس کے متعلق جانتے تھے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس کی کئی زمینیں تھیں۔ اچھا کھاتا پیتا زمیندار تھا کہ اچانک دماغ الٹ گیا۔

اس کے رشتہ دار لوہے کی موٹی موٹی زنجیروں میں اسے باندھ کر لائے اور پاگل خانے میں داخل کرا گئے۔ مہینے میں ایک بار ملاقات کے لیے یہ لوگ آتے تھے اور اس کی خیر خیریت دریافت کر کے چلے جاتے تھے۔ ایک مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پر جب پاکستان، ہندوستان کی گڑبڑ شروع ہوئی تو ان کا آنا بند ہو گیا۔

اس کا نام بشن سنگھ تھا مگر اسے ٹوبہ ٹیک سنگھ کہتے تھے۔ اس کو یہ قطعاً معلوم نہیں تھا کہ دن کون سا ہے، مہینہ کون سا ہے یا کتنے سال بیت چکے ہیں۔ لیکن ہر مہینے جب اس کے عزیز و اقارب اس سے ملنے کے لیے آتے تھے تو اسے اپنے آپ پتہ چل جاتا تھا۔ چنانچہ

وہ دفعدار سے کہتا کہ اس کی ملاقات آ رہی ہے۔ اس دن وہ اچھی طرح نہاتا، بدن پر خوب صابن گھستا اور سر میں تیل لگا کر کنگھا کرتا، اپنے کپڑے جو وہ کبھی استعمال نہیں کرتا تھا، نکلوا کے پہنتا اور یوں سج کر ملنے والوں کے پاس جاتا۔ وہ اس سے کچھ پوچھتے تو وہ خاموش رہتا یا کبھی کبھار ''او پردی گڑ گڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف دی لالٹین'' کہہ دیتا۔

اس کی ایک لڑکی تھی جو ہر مہینے ایک انگلی بڑھتی بڑھتی پندرہ برسوں میں جوان ہوگئی تھی۔ بشن سنگھ اس کو پہچانتا ہی نہیں تھا۔ وہ بچی تھی جب بھی اپنے باپ کو دیکھ کر روتی تھی، جوان ہوئی تب بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔

پاکستان اور ہندوستان کا قصہ شروع ہوا تو اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ جب اطمینان بخش جواب نہ ملا تو اس کی کرید دن بدن بڑھتی گئی۔ اب ملاقات بھی نہیں آتی تھی۔ پہلے تو اسے اپنے آپ پتہ چل جاتا تھا کہ ملنے والے آ رہے ہیں، پر اب جیسے اس کے دل کی آواز بھی بند ہوگئی تھی جو اسے ان کی آمد کی خبر دے دیا کرتی تھی۔

اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ لوگ آئیں جو اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے اور اس کے لیے پھل، مٹھائیاں اور کپڑے لاتے تھے۔ وہ اگر ان سے پوچھتا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟ تو وہ اسے یقیناً بتا دیتے کہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ہی سے آتے ہیں، جہاں اس کی زمینیں ہیں۔

پاگل خانے میں ایک پاگل ایسا بھی تھا جو خود کو خدا کہتا تھا۔ اس سے جب ایک روز بشن سنگھ نے پوچھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں تو اس نے حسب عادت قہقہہ لگایا اور کہا، ''وہ پاکستان میں ہے نہ ہندوستان میں۔ اس لیے کہ ہم نے ابھی تک حکم نہیں دیا۔''

بشن سنگھ نے اس خدا سے کئی مرتبہ منت سماجت سے کہا کہ وہ حکم دیدے تاکہ جھنجھٹ ختم ہو، مگر وہ بہت مصروف تھا اس لیے کہ اسے اور بے شمار حکم دینے تھے۔ ایک دن تنگ آ کر وہ اس پر برس پڑا، ''او پڑدی گڑ گڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف واہے گورو جی دا خالصہ اینڈ واہے گورو جی کی فتح۔۔۔ جو بولے سونہال، ست سری اکال۔''

اس کا شاید یہ مطلب تھا کہ تم مسلمان کے خدا ہو۔۔۔ سکھوں کے خدا ہوتے تو ضرور میری سنتے۔

تبادلے سے کچھ دن پہلے ٹوبہ ٹیک سنگھ کا ایک مسلمان جو اس کا دوست تھا، ملاقات کے لیے آیا۔ پہلے وہ کبھی نہیں آیا تھا۔ جب بشن سنگھ نے اسے دیکھا تو ایک طرف ہٹ گیا اور واپس جانے لگا، مگر سپاہیوں نے اسے روکا، ''یہ تم سے ملنے آیا ہے۔۔۔ تمہارا دوست فضل دین ہے۔''

بشن سنگھ نے فضل دین کو ایک نظر دیکھا اور کچھ بڑبڑانے لگا۔ فضل دین نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، ''میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ تم سے ملوں لیکن فرصت ہی نہ ملی۔۔۔ تمہارے سب آدمی خیریت سے ہندوستان چلے گئے۔۔۔ مجھ سے جتنی مدد ہو سکی، میں نے کی۔۔۔ تمہاری بیٹی روپ کور۔۔۔'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ بشن سنگھ کچھ یاد کرنے لگا۔ ''بیٹی روپ کور!'' فضل دین نے رک رک کر کہا، ''ہاں۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔۔۔ ان کے ساتھ ہی چلی گئی۔''

بشن سنگھ خاموش رہا۔ فضل دین نے کہنا شروع کیا، ''انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری خیر خیریت پوچھتا رہوں۔۔۔ اب میں نے سنا ہے کہ تم ہندوستان جا رہے ہو۔۔۔ بھائی بلبیر سنگھ اور بھائی ودھاوا سنگھ سے میرا سلام کہنا۔۔۔ اور بہن امرت کور سے بھی۔۔۔ بھائی بلبیر سے کہنا فضل دین راضی خوشی ہے۔۔۔ دو بھوری بھینسیں جو وہ چھوڑ گئے تھے، ان میں سے ایک نے کٹا دیا ہے۔۔۔ اور دوسری کے کٹی ہوئی تھی پر وہ چھ دن کی ہو کے مر گئی۔۔۔ اور۔۔۔ میرے لائق جو خدمت ہو کہنا، میں ہر وقت تیار ہوں۔۔۔ اور یہ تمہارے لیے تھوڑے سے مرونڈے لایا ہوں۔''

بشن سنگھ نے مرونڈوں کی پوٹلی لے کر پاس کھڑے سپاہی کے حوالے کر دی اور فضل دین سے پوچھا، ''ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟'' فضل دین نے قدرے حیرت سے کہا، ''کہاں ہے۔۔۔ وہیں ہے جہاں تھا۔'' بشن سنگھ نے پھر پوچھا، ''پاکستان میں یا ہندوستان

میں؟''

''ہندوستان میں۔۔۔نہیں نہیں، پاکستان میں۔'' فضل دین بوکھلا سا گیا۔

بشن سنگھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔''اوپڑدی گڑگڑدی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف پاکستان اینڈ ہندوستان آف دی درفٹے منہ۔''

تبادلے کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر آنے والے پاگلوں کی فہرستیں پہنچ گئی تھیں اور تبادلے کا دن بھی مقرر ہو چکا تھا۔سخت سردیاں تھیں، جب لاہور کے پاگل خانے سے ہندو، سکھ پاگلوں سے بھری ہوئی لاریاں پولیس کے محافظ دستے کے ساتھ روانہ ہوئیں۔متعلقہ افسر بھی ہمراہ تھے۔واہگہ کے بارڈر پر طرفین کے سپرنٹنڈنٹ ایک دوسرے سے ملے اور ابتدائی کاروائی ختم ہونے کے بعد تبادلہ شروع ہو گیا جو رات بھر جاری رہا۔

پاگلوں کو لاریوں سے نکالنا اور ان کو دوسرے افسروں کے حوالے کرنا بڑا کٹھن کام تھا۔بعض تو باہر نکلتے ہی نہیں تھے۔جو نکلنے پر رضامند ہوئے تھے، ان کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا کیوں کہ ادھر ادھر بھاگ اٹھتے تھے، جو ننگے تھے، ان کو کپڑے پہنائے جاتے وہ پھاڑ کر اپنے تن سے جدا کر دیتے۔کوئی گالیاں بک رہا ہے۔کوئی گا رہا ہے۔آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔رو رہے ہیں، بلک رہے ہیں۔کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔پاگل عورتوں کا شور و غوغا الگ تھا اور سردی اتنی کڑاکے کی تھی کہ دانت سے دانت بج رہے تھے۔

پاگلوں کی اکثریت اس تبادلے کے حق میں نہیں تھی، اس لیے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انھیں اپنی جگہ سے اکھاڑ کر کہاں پھینکا جا رہا ہے۔وہ چند جو کچھ سوچ سمجھ سکتے تھے۔'پاکستان زندہ باد' اور 'پاکستان مردہ باد' کے نعرے لگا رہے تھے۔دو تین مرتبہ فساد ہوتے ہوتے بچا کیوں کہ بعض مسلمانوں اور سکھوں کو یہ نعرہ سن کر طیش آ گیا تھا۔

جب بشن سنگھ کی باری آئی اور واہگہ کے اس پار متعلقہ افسر اس کا نام رجسٹر میں درج کرنے لگا تو اس نے پوچھا،''ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔۔۔پاکستان میں یا ہندوستان میں؟''

متعلقہ افسر ہنسا،''پاکستان میں۔''

یہ سن کر بشن سنگھ اچھل کر ایک طرف ہٹا اور دوڑ کر اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔

پاکستانی سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اور دوسری طرف لے جانے لگے، مگر اس نے چلنے سے انکار کر دیا،''ٹوبہ ٹیک سنگھ یہاں ہے۔۔۔''اور زور زور سے چلانے لگا،''اوپڑدی گڑگڑدی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف ٹوبہ ٹیک سنگھ اینڈ پاکستان۔''

اسے بہت سمجھایا گیا کہ دیکھو اب ٹوبہ ٹیک سنگھ ہندوستان میں چلا گیا ہے۔۔۔اگر نہیں گیا تو اسے فوراً وہاں بھیج دیا جائے گا، مگر وہ نہ مانا۔جب اس کو زبردستی دوسری طرف لے جانے کی کوشش کی گئی تو وہ درمیان میں ایک جگہ اس انداز میں اپنی سوجی ہوئی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا جیسے اب اسے کوئی طاقت وہاں سے نہیں ہلا سکے گی۔

آدمی چونکہ بے ضرر تھا اس لیے اس سے مزید زبردستی نہ کی گئی۔اس کو وہیں کھڑا رہنے دیا گیا اور تبادلے کا باقی کام ہوتا رہا۔

سورج نکلنے سے پہلے ساکت و صامت بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی۔ادھر ادھر سے کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا تھا، اوندھے منہ لیٹا ہے۔ادھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندوستان تھا۔۔۔ادھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان۔درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا، ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا۔

3.2.2 ٹوبہ ٹیک سنگھ کا فنی تجزیہ

سعادت حسن منٹو کا افسانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ اردو ادب کا ایک ایسا شاہکار ہے جو نہ صرف تقسیم ہند کے المیے کی عکاسی کرتا ہے بلکہ

انسانی بے بسی، اور شناخت کے بحران کو انتہائی فنکارانہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ یہ فسادات سے متاثر اذہان یعنی پاگلوں اور ان کی حرکات و سکنات نیز ان کی اپنے وطن سے محبت کے موضوع پر لکھا ہوا ایک بہترین افسانہ ہے جس میں منٹو نے پاگلوں کے ذریعے ہندوستان کی تقسیم اور ہجرت کے موضوع کو طنزیہ انداز میں پیش کیا ہے۔

آزادی کے بعد جب ہندوستان اور پاکستان کے عوام ٹھیک ٹھیک اپنی جگہ پر پہنچ گئے اور تمام پناہ گزینوں کا مسئلہ حل ہو گیا تب دونوں جانب کے حکمرانوں نے یہ سلسلہ شروع کیا کہ پاگلوں کو بھی ایک ملک سے دوسرے ملک منتقل کر دینا چاہیے۔ لیکن پاگل ان تمام کارروائیوں سے پرے اس بات کو سمجھنے میں لگے ہوئے تھے کہ ہندوستان کہاں ہے اور پاکستان کہاں ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس امر کو سلجھانے میں مزید پاگل ہوتے چلے گئے اور عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگے۔ یہ حرکات و سکنات بظاہر تو ان کے پاگل پن کا ثبوت تھیں لیکن اگر نفسیاتی طور پر ان کا مطالعہ کیا جائے تو یہ ان کی محبت اور خلوص کو ظاہر کرتی ہیں جو انہیں اپنے وطن اور ہم وطنوں سے تھی۔ اس ضمن میں منٹو نے ایک مسلم پاگل کا ذکر کیا ہے جو ایک اونچے درخت پر چڑھ جاتا ہے اور سپاہیوں کے کہنے پر بھی نیچے نہیں آتا ہے۔ اس لیے کہ نہ تو وہ ہندوستان میں رہنا چاہتا ہے اور نہ پاکستان۔ میں بعد میں جب اس کے دورے میں کمی واقع ہوتی ہے تو وہ نیچے آ کر اپنے ہندو پاگل دوستوں سے گلے لگ کر روتا ہے کہ وہ اسے چھوڑ کر نہ جائیں۔ انسان دوستی کی عجیب غریب مثال منٹو نے اس افسانے میں پیش کی ہے۔

انہی پاگلوں میں ایک سکھ پاگل بشن سنگھ تھا جو 15 سال پہلے اس پاگل خانے میں داخل ہوا تھا۔ اس کے گھر کے تمام افراد اس سے ملنے آتے تھے وہ ہمیشہ چند عجیب سے الفاظ ہر وقت کہتا رہتا تھا جن کا بظاہر تو کوئی مطلب نہیں تھا لیکن وہ اس کے لاشعور میں بسے کسی واقعے کے نمائندگی کرتے تھے۔ پھر جب پاکستان بنا اور اس نے پاگلوں کے تبادلے کا ذکر سنا تو ان بے ربط الفاظ میں پاکستان اور ہندوستان گورنمنٹ کا بھی نام جڑ گیا۔ ''اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی مونگ دی دال آف دی پاکستان اینڈ ہندوستان در فٹے منہ۔''

یہ پاگل 15 سال سے اسی پاگل خانے میں کھڑا تھا۔ نہ ہی وہ سوتا تھا، نہ ہی بیٹھتا تھا۔ صرف کبھی کبھی دیوار سے ٹیک لگا لیتا تھا۔ یہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کا رہنے والا تھا اور اسے اپنے وطن سے بے حد محبت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس نے سنا کہ ہندوستان اور پاکستان بن گئے ہیں تو اسے یہ فکر لاحق ہو گئی کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ وہ ہر کسی سے پوچھتا رہتا تھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ اسی وجہ سے اس کا نام ٹوہ ٹیک سنگھ پڑ گیا تھا لیکن کوئی بھی اسے یہ نہیں بتا سکا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔

تبادلے کے تمام کارروائیاں مکمل ہو جانے کے بعد افسران انہیں لے کر واگہہ سرحد کی طرف چل دیتے ہیں۔ منٹو نے تبادلے کے وقت پاگلوں کی ذہنی کیفیت کو بہ حسن خوبی بیان کیا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ یہ لوگ شعور و خرد سے محروم تھے لیکن اس کے باوجود ان کے حرکات و سکنات سے اس بات کی ناپسندیدگی کا اظہار ہو رہا تھا کہ وہ اپنے وطن سے باہر نہیں جانا چاہتے تھے اور احتجاج کے طور پر وہ عجیب و غریب حرکتیں کرنا شروع ہو گئے۔

بشن سنگھ ٹوبہ ٹیک سنگھ کا اچھا کھاتا پیتا زمین دار تھا۔ اچانک اس کا دماغ الٹ گیا اور اس کے رشتہ داروں اسے لوہے کی موٹی موٹی زنجیروں میں باندھ کر لائے اور پاگل خانے میں داخل کرا گئے تھے۔ یہاں رہتے ہوئے اسے 15 سال بیت گئے تھے۔ وہ ایک بے ضرر پاگل تھا اور جب اس کے عزیز و اقارب اس سے ملنے آتے تھے وہ نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہن کر ان کے سامنے جاتا تھا۔ اسے وقت کا کوئی احساس نہیں تھا یعنی کہ دن کون سا ہے مہینہ کون سا ہے اور کتنے سال گزر چکے ہیں۔ وہ اپنی بیٹی کو بھی نہیں پہچان پاتا تھا جو ان 15 برسوں میں جوان ہو چکی تھی اور ہر مہینے اس سے ملنے آتی تھی۔ لیکن یہ بات حیران کن طور سے اسے یاد تھی کہ وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کا رہنے والا ہے۔ اسے تقسیم ملک کے سانحے اور اس کے نتیجے میں ہونے والے فسادات کی تفصیلات بھی نہیں معلوم تھیں۔

اسے یہ جاننے کی شدید جستجو تھی کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ہندوستان میں ہے یا پاکستان میں۔ کیونکہ وہ اپنے وطن سے دور نہیں رہنا چاہتا تھا اس لیے وہ کہیں اور بھیج دیے جانے کے خیال سے خوفزدہ رہتا تھا۔ یہاں پر خوف کے نفسیات بیان کی گئی ہیں اور یہ خوف اس وقت

اپنے انتہا کو پہنچ جاتا ہے جب اس کا ایک مسلمان دوست اسے اس کے عزیز و اقارب کے ہندوستان چلے جانے کی اطلاع دینے آتا ہے اور اس کے پوچھنے پر بتا دیتا ہے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے۔

یہاں حالات نیا اختیار کر لیتے ہیں اور بظاہر فرماں بردار اور بے ضرر نظر آنے والا بشن سنگھ حالات کی آندھی کے آگے مضبوط چٹان بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہاں پر بشن سنگھ کی شخصیت کے جوہر کھل کر سامنے آتے ہیں۔ جب اسے زبردستی سرحد پار کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے تو وہ درمیان میں اسی جگہ اسی انداز میں ٹانگوں پر جو پندرہ برس تک کھڑے رہنے کے بعد سوج گئی تھیں کھڑا ہو جاتا ہے جیسے دنیا کی کوئی طاقت اسے وہاں سے ہلا نہیں پائے گی۔ آخر کار صبح ہوتے ہوتے وہ اسی جگہ پہ گر کر اپنی جان دے دیتا ہے۔ خاردار تاروں کے ایک طرف ہندوستان تھا اور دوسری طرف پاکستان جب کہ درمیان میں زمین کے ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا بشن سنگھ پڑا ہوا تھا۔ وہ مرتے مرتے دنیا کو احساس دلا جاتا ہے کہ سیاست کے ہتھکنڈے حب الوطنی کے جذبے کو ختم نہیں کر سکتے۔

ایک عام خیال یہ ہے کہ پاگل صرف پاگل خانے کے چار دیواری تک کی محدود رہتے ہیں۔ اور باہر کی دنیا میں صرف سیانے لوگ ہی بستے ہیں لیکن منٹو نے بڑے لطیف اشاروں سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ چار دیواری سے باہر زیادہ خطرناک پاگل موجود ہیں۔ جن کی تخریبی ذہنیت اور طاقت نہ صرف زمینوں کے ٹکڑے کر دیتی ہے بلکہ ہزاروں لاکھوں انسانوں کو بھی بے سہارا کر دیتی ہے۔ پاگل خانے کی چار دیواری میں سبھی لوگ پاگل نہیں ہوتے۔ لاہور کے جس پاگل خانے کا ذکر منٹو نے کیا ہے ان میں اکثریت ایسے قاتلوں کی ہوتی ہے جن کے رشتہ داروں نے افسروں کو کچھ دے دلا کر انہیں پاگل خانے بھیج دیا ہے تا کہ وہ پھانسی کے پھندے سے بچ جائیں۔

افسانے کا موضوع تقسیم ہند کے بعد انسانوں پر پڑنے والا ذہنی و جذباتی اثر ہے۔ منٹو نے پاگل خانے کے پس منظر میں ایک ایسا منظر نامہ تخلیق کیا ہے جو دراصل پورے برصغیر کے اجتماعی پاگل پن کی علامت بن گیا۔ پاگل خانے کے قیدی اصل میں ان انسانوں کی نمائندگی کرتے ہیں جنہوں نے تقسیم ہند کے بعد اپنی زمین، پہچان، مذہب اور رشتے سب کچھ کھو دیئے۔

منٹو کا سب سے کارگر ہتھیار ان کی زبان ہے جو افسانے کے لئے بے حد موزوں ہے۔ اس افسانے میں منٹو کا اسلوب سادہ، رواں اور حقیقت سے بے حد قریب ہے۔ وہ غیر ضروری تشبیہات اور مبالغہ آمیز زبان سے گریز کرتے ہیں۔ افسانے میں مکالمے کم اور مختصر ہیں۔ جب کہ زبان میں طنز، درد اور کرب کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ گہرا طنز منٹو کے اسلوب کی خاصیت ہے۔ افسانہ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' بھی طنز اور المیہ کا ایک حسین امتزاج ہے۔ افسانے کی ساخت میں منطقی ربط بھی ہے نیز واقعات میں ہم آہنگی بھی۔ ان کے مخصوص انداز بیان جس میں فقروں اور جملوں کی تکرار شامل ہے، نے افسانے میں حب الوطنی کے جذبے کو مزید ابھار دیا ہے۔ اس عنصر نے افسانے میں گہری معنویت اور تہہ داری پیدا کر دی ہے۔ اس افسانے کی قرأت کے بعد قاری ذہنی طور پر بے حد متاثر ہوتا ہے۔

اس افسانے میں منٹو کی کردار نگاری اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ افسانے کے مرکزی کردار بشن سنگھ کی تخلیق میں انہوں نے کمال فنکاری سے کام لیا ہے۔ منٹو نے ایک پاگل کی نفسیات اور اس کے جذبات و احساسات اس انداز میں بیان کی ہے اس میں ذرا بھی مصنوعی پن کا احساس نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ منٹو خود بھی دو بار اپنا ذہنی توازن کھو چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض دفعہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت اور ان کے کردار ایک دوسرے کا آئینہ ہیں۔

"ٹوبہ ٹیک سنگھ" اردو افسانے کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ منٹو نے اپنے فنی کمال، حقیقت نگاری، علامتی انداز اور مکالماتی قوت کے ذریعے ایک تاریخی واقعے کو انسانی المیے میں تبدیل کر دیا۔ یہ افسانہ نہ صرف تقسیمِ ہند کی داستان ہے بلکہ انسانیت کے زخموں کا نوحہ بھی ہے۔ منٹو نے ثابت کیا کہ وہ محض کہانی نہیں لکھتے، بلکہ انسان کے دکھ کو لفظوں میں جیتا جاگتا بنا دیتے ہیں۔

خود اکتسابی کے لئے سوالات I

خالی جگہیں پُر کیجیے۔

1۔سعادت حسن منٹو کا افسانہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اردو ادب کا ایک ایسا شاہکار ہے۔

2۔انسان دوستی کی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مثال منٹو نے اس افسانے میں پیش کی ہے۔

3۔منٹو نے تبادلے کے وقت پاگلوں کی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کو بہ حسن خوبی بیان کیا ہے۔

4۔افسانے کا موضوع۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کے بعد انسانوں پر پڑنے والا ذہنی و جذباتی اثر ہے۔

5۔افسانے کے مرکزی کردار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کی تخلیق میں انہوں نے کمال فنکاری سے کام لیا ہے۔

4.2.3 زبان کی مہارتیں (لکھنے کے حوالے سے)

لکھنے کی مہارت یعنی writing skill سے مراد وہ صلاحیت ہے جس کے ذریعے انسان اپنے خیالات، جذبات، احساسات، معلومات، تجربات اور پیغامات کو واضح، مؤثر اور خوبصورت انداز میں تحریر کے ذریعے بیان کر سکے۔یعنی اپنی سوچ کو منظّم کر کے اسے الفاظ کے مناسب ترتیب وانتخاب کے ساتھ پیش کرنا لکھنے کی مہارت ہے۔اس ضمن میں تشبیہات و استعارات، علامت، تمثیل، محاورے اور دیگر فنی لوازم کے استعمال سے تحریر کے حسن اور دلکشی میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔لکھنے کی مہارت کی سب سے بڑی خوبی ربط اور تسلسل ہے۔ذیل میں ہم منٹو کے شاہکار افسانے 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' کا لکھنے کی مہارت کے حوالے سے جائزہ لیں گے۔

سعادت حسن منٹو اردو ادب کے عظیم افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے انسانی نفسیات، سماجی تضادات اور حقیقت کے تلخ پہلوؤں کو نہایت جرات اور فنی مہارت کے ساتھ پیش کیا۔منٹو کا فن اپنے اندر وہ سچائی رکھتا ہے جو دلوں کو چیر کر گزر جاتی ہے۔وہ لفظوں کے ایسے جادوگر ہیں جنہوں نے عام انسان کے دکھ، بے بسی اور بکھراؤ کو اپنی تحریروں کے ذریعے ابدی معنویت عطا کی۔انہی شاہکار تخلیقات میں ایک افسانہ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' ہے، جو تقسیمِ ہند کے المیے پر مبنی ہے اور منٹو کی فنی عظمت، حقیقت نگاری اور تحریری مہارت کا بہترین مظہر ہے۔

منٹو کی تحریری مہارت کا سب سے نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ پیچیدہ اور تلخ موضوعات کو سادہ اور مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ان کے جملے چھوٹے، رواں اور معنی سے بھرپور ہوتے ہیں۔ان کی تحریر میں غیر ضروری تفصیل نہیں، بلکہ ہر لفظ ایک خاص مقصد کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔'ٹوبہ ٹیک سنگھ' میں انہوں نے بیوروکریسی، سیاست اور تقسیم کے جنونی ماحول کو طنز اور علامت کے پیرائے میں اس طرح بیان کیا کہ قاری اس کے درد کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ایک اقتباس دیکھیں:

> ''پاگلوں کی اکثریت اس تبادلے کے حق میں نہیں تھی، اس لئے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انہیں اپنی جگہ سے اکھاڑ کر کہاں پھینکا جا رہا ہے۔وہ چند جو کچھ سوچ سمجھ سکتے تھے۔'پاکستان زندہ باد' اور پاکستان مردہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔دو تین مرتبہ فساد ہوتے ہوتے بچا کیوں کہ بعض مسلمانوں اور سکھوں کو یہ نعرہ سن کر طیش آ گیا تھا۔''

افسانے کی زبان اور بیان میں سادگی کے باوجود گہرائی پائی جاتی ہے۔منٹو نے کسی خطیبانہ یا ادبی زبان کا سہارا نہیں لیا بلکہ روزمرہ کے بول چال کے الفاظ کے ذریعے کرداروں کی ذہنی کیفیت کو بیان کیا۔خاص طور پر بشن سنگھ کی زبان میں جو بے ربط جملہ ''اوپڑ

دی گرگڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی مونگ دی وال آف دی لالٹین'' ہے، وہ محض ایک پاگل کی بڑ نہیں بلکہ اس دور کی اجتماعی پاگل پن کی علامت بن جاتا ہے۔ یہ وہ فنی قوت ہے جو منٹو کی لکھنے کی مہارت کو منفرد بناتی ہے۔

کردار نگاری کے لحاظ سے بھی منٹو کی مہارت بے مثال ہے۔ انہوں نے بشن سنگھ کے کردار کو نہایت سادگی کے ساتھ پیش کیا، مگر اس کے رویے، خاموشیوں اور سوالوں کے ذریعے ایک گہرا پیغام دیا۔ اس کردار کے ذریعے منٹو نے انسان کی گمشدہ شناخت، وطن سے جذباتی وابستگی اور عقل و جنون کے درمیان دھندلی لکیر کو نمایاں کیا۔ یہ کردار منٹو کے فنی شعور اور لکھنے کی مہارت کی گواہی دیتا ہے، کیونکہ وہ کرداروں کو تراشتے نہیں، بلکہ انہیں زندگی سے اٹھا کر صفحۂ قرطاس پر رکھ دیتے ہیں۔

افسانے کی فنی ساخت منٹو کے اعلیٰ تخلیقی شعور کا ثبوت ہے۔ کہانی کی ابتدا ایک عام صورتِ حال سے ہوتی ہے، لیکن رفتہ رفتہ قاری کو ایک ایسی فضا میں لے جاتی ہے جہاں طنز، حقیقت اور المیہ ایک دوسرے میں گھل مل جاتے ہیں۔ پلاٹ نہایت مربوط ہے، واقعات کا تسلسل قاری کی دلچسپی کو آخر تک برقرار رکھتا ہے، اور اختتام پر ایک گہرا تاثر چھوڑتا ہے۔ افسانے کا آخری منظر جب بشن سنگھ سرحد کے درمیان زمین پر گر جاتا ہے۔ دراصل اس بات کی علامت ہے کہ انسانیت سرحدوں کے بیچ کہیں کھو گئی ہے۔ یہ علامتی انجام منٹو کی تخلیقی قوت اور تحریری گہرائی کا بہترین نمونہ ہے۔

منٹو کے طنز میں بھی ان کی لکھنے کی مہارت جھلکتی ہے۔ انہوں نے پاگل خانے کو پس منظر بنا کر پورے برصغیر کی ذہنی کیفیت کو اجاگر کیا ہے۔ یہ طنز قاری کو ہنساتا نہیں بلکہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ ان کی تحریر میں وہ قوت ہے جو بظاہر معمولی واقعے کو گہرے فکری مفہوم میں تبدیل کر دیتی ہے۔ ان کے جملے مختصر مگر کثیر المعنی ہیں، جن کے پیچھے پوری تہذیبی تاریخ کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

'ٹوبہ ٹیک سنگھ' اردو ادب کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ افسانہ محض تقسیم کے پس منظر میں لکھا گیا سیاسی یا تاریخی بیان نہیں بلکہ انسانیت کے بٹنے، عقل کے زوال اور شناخت کے بحران کا استعارہ ہے۔ اس میں منٹو نے یہ دکھایا کہ انسان نے جب الوطنی اور مذہب کے نام پر سرحدیں کھینچیں تو اس نے دراصل اپنی انسانیت کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ بشن سنگھ کی سرحد کے درمیان موت اس بات کی علامت ہے کہ انسانیت کا کوئی وطن نہیں رہا۔

یہ افسانہ منٹو کی حقیقت نگاری، علامتی انداز اور فکری گہرائی کا امتزاج ہے۔ انہوں نے سادہ واقعے میں اتنا بڑا مفہوم سمو دیا کہ یہ کہانی محض ایک پاگل کی نہیں بلکہ پورے عہد کے پاگل پن کی داستان بن گئی۔ ادبی اعتبار سے یہ افسانہ اس لیے بھی اہم ہے کہ منٹو نے اس میں علامت اور حقیقت کو اس طرح جوڑا کہ اردو افسانے کو ایک نئی سمت عطا ہوئی۔

مختصراً، 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' منٹو کے فنی کمال، حقیقت نگاری اور لکھنے کی غیر معمولی مہارت کا شاہکار ہے۔ انہوں نے مختصر جملوں، گہرے تاثر، علامتی زبان اور فطری مکالموں کے ذریعے تقسیمِ ہند کے المناک پہلو کو زندہ کر دیا۔ یہ افسانہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ سرحدیں جسموں کو تو بانٹ سکتی ہیں، مگر انسانیت کو نہیں۔ منٹو کا قلم وہ آئینہ ہے جس میں ہم آج بھی اپنے سماج، اپنی سیاست اور اپنی انسانیت کا بکھرا ہوا چہرہ دیکھ سکتے ہیں۔ یہی اس افسانے کی اصل اہمیت اور منٹو کی لکھنے کی مہارت کا عروج ہے۔

4.2.4 قواعد (فاعل، مفعول)

فاعل اور مفعول نحو یعنی گرامر کے دو اہم اجزا ہیں۔

فاعل: فاعل وہ اسم مشتق ہے جو کام کے کرنے والے کو ظاہر کرے یا جس کی ذات سے کام کا کرنا یا ہونا ظاہر ہے۔ آسان لفظوں میں کہیں تو کسی کام کو کرنے والا یعنی وہ شخص، چیز یا جاندار جو کام کرتا ہے۔ مثلا: احمد پڑھتا ہے۔ اس جملے میں احمد پڑھائی کر رہا ہے لہذا احمد فاعل ہے۔ اسی طرح 'لڑکی ہنستی ہے'۔ اس جملے میں لڑکی ایک کام انجام دے رہی ہے لہذا لڑکی فاعل ہوگی۔

مفعول: مفعول اس شخص، چیز یا جاندار کو کہتے ہیں جس پر کام کیا جائے۔ یعنی وہ اسم جس پر فاعل کے کام کا اثر ہو۔ مثلا: علی نے

کھانا کھایا۔اس جملے میں علی کے کام کا اثر کھانے پر ہو رہا ہے۔یعنی کھانے کو کھایا جا رہا ہے،لہذا اس جملے میں مفعول 'کھانا' ہوگا۔
اسی طرح 'بچہ سائیکل چلاتا ہے۔اس جملے میں سائیکل مفعول ہوگی۔

سعادت حسن منٹو کا افسانہ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' ادبی لحاظ سے اہم ہونے کے ساتھ قواعد کے اعتبار سے بھی بے حد اہم ہے۔اس افسانے میں ہم جا بجا فاعل اور مفعول کی مثالیں دیکھ سکتے ہیں۔لیکن منٹو کے اس مشہور افسانے میں فاعل اور مفعول کی تقسیم صرف قواعد کی سطح پر نہیں بلکہ علامتی اور فکری سطح پر بھی دیکھی جا سکتی ہے۔افسانے میں بظاہر فاعل وہ کردار ہیں جو عمل کر رہے ہیں،مثلا: حکومتیں، اہلکار، سپاہی، پاگل خانے کے ملازم، اور خود پاگل۔لیکن گہرائی میں دیکھا جائے تو اصل فاعل وہ طاقتیں ہیں جو انسانوں کی تقدیر کا فیصلہ کرتی ہیں،یعنی حکومتیں، سیاست دان اور تقسیم کا نظام۔

جب کہ ان کے مقابلے میں مفعول وہ عام انسان ہیں جو ان فیصلوں کا نشانہ بنتے ہیں،جن پر یہ اعمال واقع ہوتے ہیں، خاص طور پر وہ پاگل جو بے گناہ اور بے خبر ہو کر بھی ان فیصلوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔

افسانے کے آغاز میں ہی حکومتیں فاعل کے طور پر سامنے آتی ہیں۔مثلا یہ جملہ:

''پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کو خیال آیا کہ پاگلوں کا تبادلہ بھی ہونا چاہیے۔''

یہاں فاعل حکومت ہے اور مفعول پاگل۔یہ جملہ پورے افسانے کی بنیاد رکھ دیتا ہے کہ انسانی زندگی اب حکومتی فیصلوں کی مفعول بن چکی ہے،انسان کی اپنی مرضی، اس کی خواہش، اس کا اختیار سب چھن چکا ہے۔

اسی طرح جملہ ہے:

''وہ مسلمان پاگل جن کے لواحقین ہندوستان ہی میں تھے، وہیں رہنے دیے گئے۔''

اس میں فاعل حکومت یا پاگل خانے کے منتظم ہیں جو فیصلہ کر رہے ہیں،اور مفعول وہ 'مسلمان پاگل' ہیں جنہیں ایک خاص مقام پر رکھا جا رہا ہے۔

ایک اور جملہ ہے:

''جتنے ہندو، سکھ پاگل تھے سب کے سب پولیس کی حفاظت میں بارڈر پر پہنچا دیے گئے۔''

یہاں فاعل 'پولیس' یا حکومتی انتظامیہ ہے،اور مفعول 'ہندو، سکھ پاگل' ہیں جو حرکت یا عمل کا نشانہ بنے۔

پاگل خانے کے اندر جب یہ خبر پہنچتی ہے تو وہاں کے پاگلوں کے ردِعمل سے ایک نیا پہلو سامنے آتا ہے۔اب پاگل خود بھی فاعل بننے کی کوشش کرتے ہیں۔کوئی نعرہ لگاتا ہے، کوئی بحث کرتا ہے، کوئی درخت پر چڑھ جاتا ہے۔مگر ان کا یہ عمل بھی دراصل ایک بے اثر عمل ہے، کیونکہ نتیجہ ان کے اختیار میں نہیں۔ان کا ہر عمل کسی اور کی مرضی سے رد یا قبول ہوتا ہے۔اس طرح وہ بظاہر فاعل ہیں، مگر حقیقت میں مفعول ہی رہتے ہیں۔

بشن سنگھ کا کردار اس پہلو کو سب سے زیادہ گہرائی سے ظاہر کرتا ہے۔وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کا رہنے والا ہے اور پندرہ برس سے پاگل خانے میں بند ہے۔اس کی ساری جستجو ایک سوال پر مرکوز ہے:''ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟''

یہ سوال بظاہر جغرافیائی ہے مگر معنوی طور پر وجودی سوال بن جاتا ہے۔انسان کہاں کھڑا ہے، وہ کس سرزمین کا ہے، اس کی شناخت کس کے تابع ہے؟ یہاں بشن سنگھ، مفعول ہونے کے باوجود، سوال کے ذریعے ایک 'خودمختار فاعل' بننے کی کوشش کرتا ہے۔مگر دنیا کے نظام میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں۔آخر میں جب سرحد کے بیچوں بیچ نومینس لینڈ پر وہ گر جاتا ہے، تو یہی گرنا انسان کے بے وطن ہونے، مفعول ہونے اور اپنے وجود کی شکست کا استعارہ بن جاتا ہے۔

اگر دیکھا جائے تو پورے افسانے میں فاعل اور مفعول کا رشتہ بدلتا رہتا ہے۔جنھیں عقل مند کہا گیا، وہ پاگلوں پر حکومت کرتے ہیں، مگر ان کے فیصلے اتنے غیر معقول ہیں کہ خود وہ بھی پاگل معلوم ہوتے ہیں۔اور جو پاگل کہلاتے ہیں، وہ حقیقت کے قریب تر ہیں،

کیونکہ وہ سچ پوچھنے کی ہمت رکھتے ہیں۔اس طرح منٹو نے دکھایا کہ اصل فاعل اور اصل مفعول کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔ بٹوارے کے بعد سب ایک طرح کے قیدی بن جاتے ہیں۔افسانے میں ایک پاگل کا ذکر اس طرح ہے:

''ایک پاگل تو پاکستان اور ہندوستان اور ہندوستان اور پاکستان کے چکر میں کچھ ایسا گرفتار ہوا کہ اور زیادہ پاگل ہو گیا۔ جھاڑو دیتے ایک دن درخت پر چڑھ گیا اور ٹہنی پر بیٹھ کر دو گھنٹے مسلسل تقریر کرتا رہا۔''

اس جملے میں فاعل 'پاگل' ہے جبکہ مفعول درخت، ٹہنی اور تقریر ہیں۔

اسی طرح جملہ:

''سپاہیوں نے اسے نیچے اترنے کو کہا۔''

میں فاعل سپاہی ہیں، اور مفعول اسے یعنی وہ پاگل ہے جس سے کہا جا رہا ہے۔

جب منٹو لکھتے ہیں:

''اس نے تمام کپڑے اتار کر دفعدار کے حوالے کر دیے۔''

تو یہاں فاعل وہ پاگل ہے جس نے عمل انجام دیا، اور مفعول کپڑے ہیں جنہیں اس نے کسی کے حوالے کیا۔

افسانے میں کئی جملے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ منٹو کے افسانے میں فاعل ہمیشہ وہ قوتیں ہیں جو طاقت کی مالک ہیں۔ مثلاً: حکومتیں، سپاہی، ادارے، یا وہ کردار جو بظاہر آزاد نظر آتے ہیں۔ جب کہ مفعول زیادہ تر وہ انسان ہیں جو ان کے فیصلوں کے اثر میں آتے ہیں۔ جیسے: قیدی، پاگل اور مجرم وغیرہ۔ اس طرح اس افسانے میں فاعل اور مفعول کا رشتہ محض زبان کا نہیں، بلکہ طاقت، اختیار اور مظلومیت کا استعارہ بن جاتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

افسانے میں چنیوٹ کے ایک موٹے مسلمان پاگل کا ذکر کرتے ہوئے منٹو نے لکھا ہے:

''اس نے ایک دن اپنے جنگلے میں اعلان کر دیا کہ وہ قائداعظم محمد علی جناح ہے۔''

اس جملے کا فاعل چنیوٹ کا پاگل ہے، اور مفعول اعلان ہے، یعنی وہ عمل جسے فاعل نے انجام دیا۔

اسی طرح ایک ہندو وکیل کے بارے میں آتا ہے۔

''وہ ان تمام ہندو اور مسلم لیڈروں کو گالیاں دیتا تھا جنہوں نے مل ملا کر ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دیئے۔''

یہاں فاعل وہ وکیل ہے، اور مفعول لیڈر ہیں جن پر اس کی گالیوں کا عمل واقع ہو رہا ہے۔

یہ افسانہ محض تقسیمِ ہند کا المیہ بیان نہیں کرتا بلکہ انسان اور اقتدار کے رشتے کو بھی بے نقاب کرتا ہے۔ منٹو نے بتا دیا کہ جب ریاست یا مذہب کے نام پر فیصلے کیے جاتے ہیں تو انسانیت مفعول بن جاتی ہے۔ ایک ایسی قوت جس پر تجربے کیے جاتے ہیں۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں فاعل وہ ہیں جو طاقت رکھتے ہیں، لیکن ان کی عقل بے روح ہے۔ مفعول وہ ہیں جو کمزور ہیں، مگر ان کے سوال سچے اور انسانی ہیں۔

خود اکتسابی کے لیے سوالات II

صحیح یا غلط کی نشاندہی کیجیے۔

1۔ کردار نگاری کے لحاظ سے منٹو کی مہارت بے مثال ہے۔ (صحیح یا غلط)

2۔ انہوں نے پاگل خانے کو پس منظر بنا کر پورے برصغیر کی ذہنی کیفیت کو اجاگر کیا ہے۔ (صحیح یا غلط)

3۔ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' اردو ادب کی تاریخ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا ہے۔ (صحیح یا غلط)

4۔ فاعل وہ اسم مشتق ہے جو کسی شخص کی صفت کو ظاہر کرے۔ (صحیح یا غلط)

5۔ مفعول اس شخص، چیز یا جاندار کو کہتے ہیں جس پر کام کیا جائے۔ (صحیح یا غلط)

4.3 الفاظ اور معنی

الفاظ	معنی
لواحقین	متعلقین، عیال واطفال
چہ میگوئیاں	افواہیں، خوش گپیاں
مخمصہ	الجھن، مشکل
طرفین	دونوں فریق
بےضرر	کسی کو نقصان نہ پہنچانے والا
فلک شگاف	آسمان چیر دینے والا
خاردار	کانٹے دار
شاہکار	سب سے بہترین کارنامہ، عظیم تخلیقی کارنامہ
بحران	سنگین صورت حال
پناہ گزین	پناہ لینے والے
شعور وخرد	عقل وفہم
تخریبی	خرابی یا بگاڑ پیدا کرنے والا
سنگ میل	میل کا پتھر
ابدی	غیر فانی، کبھی نہ ختم ہونے والا
المناک	غم ناک، رنج دینے والا

4.4 خود اکتسابی سوالات کے جوابات

I

1۔ٹوبہ ٹیک سنگھ
2۔عجیب وغریب
3۔ذہنی کیفیت
4۔تقسیم ہند
5۔بشن سنگھ

II

1۔صحیح

2۔صحیح

3۔غلط

4۔غلط

5۔صحیح

4.5 خلاصہ

سعادت حسن منٹو اردو ادب کے بے حد اہم افسانہ نگار ہیں۔منٹو کی افسانہ نگاری حقیقت پسندی، جراتِ اظہار اور انسانی نفسیات کی گہری بصیرت سے عبارت ہے۔ وہ معاشرے کے چھپے ہوئے سچ کو بے نقاب کرتے ہیں اور ان کرداروں کے ذریعے انسانی ضمیر کو جھنجھوڑتے ہیں جنھیں دنیا اکثر نظر انداز کرتی ہے۔منٹو کے افسانے لفظوں کا نہیں، احساسات کا آئینہ ہیں جن میں انسانیت کا دکھ، تقسیم کا درد اور سماج کی منافقت صاف جھلکتی ہے۔منٹو اپنے دور کے سب سے زیادہ باغی تخلیق کار تھے۔ وہ فنی سطح پر کبھی کسی سے سمجھوتہ نہیں کرتے تھے۔ عام طور پر ان کے افسانوں میں جنس کا موضوع حاوی رہتا ہے لیکن افسانہ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' ایک یکسر مختلف موضوع پر لکھا گیا ہے۔اس کا موضوع تقسیم ہند کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بے شمار مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ یعنی پاگلوں کی قومیت ہے۔

افسانہ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' منٹو کے فنی کمال اور فکری گہرائی کا شاہکار ہے۔اس میں تقسیمِ ہند کے المیے کو پاگل خانے کی علامت کے ذریعے پیش کیا گیا ہے، جہاں پاگلوں کے سوال، عقل مندوں کی خاموشی پر بھاری پڑتے ہیں۔بشن سنگھ کا کردار انسان کی شناخت، وطن اور وجود کے کھو جانے کی علامت ہے۔منٹو نے طنز، المیہ اور علامت کو اس طرح یکجا کیا ہے کہ افسانہ ایک طرف درد بھرا منظر نامہ بن جاتا ہے اور دوسری طرف انسانیت کی شکست کا نوحہ۔منٹو نے اس افسانے میں غیر ضروری تشبیہات، فضا آفرینی اور آرائشی زبان جیسے عناصر بالکل استعمال نہیں کئے بلکہ انہوں نے صرف پاگلوں کی نفسیات کو سیدھے سادے انداز میں بیان کر دیا ہے۔

لکھنے کی مہارت کے لحاظ سے منٹو نے سادہ مگر اثر انگیز زبان استعمال کی ہے۔ جملے مختصر ہیں مگر معنی گہرے، مکالمے فطری اور کرداروں کے مطابق ہیں۔منظر نگاری اور مکالموں کے توازن نے افسانے کو زندہ اور حقیقی بنا دیا ہے۔ان کی تحریر میں ناپ تول کر رکھی گئی سادگی، طنز کی دھار اور جذبے کی شدت مل کر ایک ایسا اسلوب پیدا کرتی ہیں جو قاری کے ذہن پر دیر پا نقش چھوڑ جاتا ہے۔

افسانے کو قواعد کی رو سے دیکھیں تو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں فاعل وہ ہیں جو طاقت رکھتے ہیں، لیکن ان کی عقل بے روح ہے۔مفعول وہ ہیں جو کمزور ہیں، مگر ان کے سوال سچے اور انسانی ہیں۔افسانے کے آخر میں بشن سنگھ کا گر جانا، دراصل انسانیت کے مفعول بن جانے کا منظر ہے—ایک ایسی انسانیت جو نہ پاکستان کی ہے، نہ ہندوستان کی، بلکہ ایک سرحد کے بیچ کھڑی رہ جاتی ہے۔

'ٹوبہ ٹیک سنگھ' فاعل اور مفعول کے فلسفیانہ تعلق کا افسانہ ہے۔ بظاہر یہ پاگلوں کے تبادلے کی کہانی ہے مگر اصل میں یہ اقتدار اور انسانیت کے تصادم کی تمثیل ہے، جہاں عمل کرنے والے اور عمل سہنے والے دونوں اپنی عقل اور اپنی زمین کھو دیتے ہیں۔

4.6 خود اکتسابی کے لئے مشق

تحریری سرگرمیاں

دیئے گئے جملوں میں فاعل اور مفعول کی نشاندہی کریں۔

''اس کا نام بشن سنگھ تھا مگر اسے ٹوبہ ٹیک سنگھ کہتے تھے۔ اس کو یہ قطعاً معلوم نہیں تھا کہ دن کون سا ہے، مہینہ کون سا ہے یا کتنے سال بیت چکے ہیں۔ لیکن ہر مہینے جب اس کے عزیز و اقارب اس سے ملنے کے لیے آتے تھے تو اسے اپنے آپ پتہ چل جاتا تھا۔ چنانچہ وہ دفعدار سے کہتا کہ اس کی ملاقات آرہی ہے۔ اس دن وہ اچھی طرح نہاتا، بدن پر خوب صابن گھستا اور سر میں تیل لگا کر کنگھا کرتا، اپنے کپڑے جو وہ کبھی استعمال نہیں کرتا تھا، نکلوا کے پہنتا اور یوں سج کر ملنے والوں کے پاس جاتا۔ وہ اس سے کچھ پوچھتے تو وہ خاموش رہتا یا کبھی کبھار ''اوپر دی گڑ گڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف دی لالٹین'' کہہ دیتا۔

اس کی ایک لڑکی تھی جو ہر مہینے ایک انگلی بڑھتی بڑھتی پندرہ برسوں میں جوان ہوگئی تھی۔ بشن سنگھ اس کو پہچانتا ہی نہیں تھا۔ وہ بچی تھی جب بھی اپنے باپ کو دیکھ کر روتی تھی، جوان ہوئی تب بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔

پاکستان اور ہندوستان کا قصہ شروع ہوا تو اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ جب اطمینان بخش جواب نہ ملا تو اس کی کرید دن بدن بڑھتی گئی۔ اب ملاقات بھی نہیں آتی تھی۔ پہلے تو اسے اپنے آپ پتہ چل جاتا تھا کہ ملنے والے آرہے ہیں، پر اب جیسے اس کے دل کی آواز بھی بند ہوگئی تھی جو اسے ان کی آمد کی خبر دے دیا کرتی تھی۔

اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ لوگ آئیں جو اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے اور اس کے لیے پھل، مٹھائیاں اور کپڑے لاتے تھے۔ وہ اگر ان سے پوچھتا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟ تو وہ اسے یقیناً بتا دیتے کہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ہی سے آتے ہیں، جہاں اس کی زمینیں ہیں۔''

کام کا تجربہ

دیئے گئے انگریزی جملوں کا اردو میں ترجمہ کریں:

1. His name was Bishon Singh but he was called tuba take singh.

2.Every month when his relatives and friends came to see him, he would kow autometically.

3.He has a daughter who grew one inch every month, literally grown young in fifteen years.

4.He had a great desire that those people who sympathized with him would come.

5. If he asked where toba take singh is? they would tell him for sure.

4.7 مشقی سوالات

1۔ سعادت حسن منٹو کے بارے میں ایک مختصر نوٹ لکھئے۔

2۔ افسانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کا فنی تجزیہ کریں۔

3۔ منٹو کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کریں۔

4۔افسانے کے حوالے سے لکھنے کی مہارت کی اہمیت بیان کریں۔
5۔فاعل اور مفعول کا فرق واضح کرتے ہوئے افسانے سے مثالیں پیش کیجیے۔

4.8 مزید مطالعے کے لئے کتب

1۔سعادت حسن منٹو،ٹوبہ ٹیک سنگھ (افسانے جلد۴)،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی،۲۰۰۵
2۔پریم گوپال متل،سعادت حسن منٹو،موڈرن پبلشنگ ہاؤس،دریا گنج،نئی دہلی،۱۹۹۹
3۔سید وقار عظیم،منٹو کا فن،اعجاز پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی،۱۹۸۲
4۔شکیل الرحمٰن،منٹو شناسی،عرفی پبلی کیشنز،ہریانہ،۲۰۰۰
5۔شمیم حنفی،منٹو:حقیقت سے افسانے تک،دہلی کتاب گھر،۲۰۱۲